افتخار جالب

مآخذ

****

افتخار جالب

مکتبۂ ادب جدید
چوک بل روڈ ، لاہور

ناشر : امان عاصم ، مکتبۂ ادب جدید
چوک بل روڈ ، لاہور

طابع : جدید اردو ٹائپ پریس
۳۹۔ چیمبرلین روڈ ، لاہور

قیمت :

بار : اول

تعداد : ایک ہزار

فہرست

والدِ محترم کی خدمت میں

لسانی اور جذباتی حرمتیں روزمرہ کے کاروبار کے لیے کتنی ضروری ھیں ؟ بہت !
لیکن یہ بھی کیا کہ ان سے سرمو انحراف نہ کیا جائے - پھر وہ حرمت ھی کیا ھوئی جو
ھر انحراف کو بلا چون و چرا قبول کر لے ؟ بالکل بجا ! میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں '
بشرطیکہ آپ ان حرمتوں کو روزمرہ کے کاروبار تک محدود رکھ سکیں - نہیں ' مجھے پھر
بھی گھن آتی ھے - یہ چوری چھپے کی وارداتیں ' چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ننھے ننھے دکھ ؛
سب کچھ بنا بنایا ھے - میں ان کا مزید تذکرہ برداشت نہیں کر سکتا - بہت ھو چکا -
اب کوئی اور بات چاھیے - باتیں بہت سی ھیں ' لیکن کہی کیوں کر جائیں - یہی مشکل
مرحلہ ھے - مجھ سے یہ نہیں ھو پاتا کہ اگلے وقتوں کا کہا سنا روایت کا کلمہ پڑھ کر
پھر سے کہہ دوں - مجھ سے اپنا زمانہ چھوڑا نہیں جاتا - یہیں ہنتا بگڑتا ھوں ' اپنا گھر
کیوں چھوڑوں - اے مری ھم رقص مجھ کو تھام لے ایسی طفلانہ خواھشیں میرے
زمانے کا ساتھ چھوڑ چکی ھیں - ان طفل تسلیوں کو آج بھی روا رکھنا بوالعجبی نہیں
تو اور کیا ھے - میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ بندھی ٹکی تکنیکی چیزوں سے لطف اندوز
ھو سکوں ' یہ اپنی حیثیت کھو چکی ھیں -

جو لوگ لسانی حرمتوں کے بڑی شد و مد سے قائل ھیں ' ان کا کہنا ھے کہ زبان
ایک سماجی فعل ھے - ھر شخص گفتگو میں سماجی مفاھیم سے مفاھمت کرتا ھے ' لگے
بندھے انداز میں اپنا مافیہ الضمیر بیان کرتا ھے اور الفاظ اور ان کے مادی حوالوں
کو درھم برھم نہیں کرتا - سماجی مفاھیم روزمرہ کی زندگی میں اپنی ارفع حیثیت منواتے

رہتے ہیں۔ سارے دھندے اسی طور چلتے ہیں تاآنکہ سماجی مفاہیم لسانی عادات کو جنم دیتے ہیں۔ ہمارے فیصلے، رد عمل اور جذباتی حرکات لسانی عادات سے سمت لیتی ہیں۔ ہماری بود و باش، لین دین، محبت، نفرت اور سوچ بچار لسانی تعینات کی پابند ہوتی ہے۔ چنانچہ صدمے، موت اور خوشی کے مواقع اپنے اپنے متوقع لسانی رویے ساتھ لاتے ہیں۔ اگر ان لسانی رویوں کو ان کے متعلقہ مواقع کے مطابق استعمال نہ کیا جائے تو معاشرتی محاسبے کی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ لسانی حرمتوں، سماجی مفاہمتوں، لسانی تعینات اور لسانی عادات کو جو چیز ایک لڑی میں پروتی ہے وہ اجتماعی اسلوب زیست ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس معاشرے میں اجتماعی اسلوب زیست جاری و ساری ہو، وہاں ان عوامل کو مکمل گرفت حاصل ہوتی ہے۔

روائتی اسلوب زیست کی بنیادیں وقت نے چھین لی ہیں!

سیاسی، سماجی اور علمی مسائل نے ہمارے اعتقادات بدل دئے ہیں۔ کیا ہماری محبت اور نفرت کے رشتے اور مفاہیم آج بعینہ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ ہرگز نہیں۔ میں ان کئی چیزوں سے نفرت نہیں کرتا جن سے میرے بزرگوں کا رشتہ محض نفرت کا رشتہ تھا۔ سعادت حسن منٹو نے ہماری ذات کی جو ترتیب و تشکیل کی ہے وہ روائتی رشتوں اور قدروں سے علیحدگی میں قائم ہوتی ہے۔ اچھا بھلا جیتا ہوں۔ مفاہمت کی کمی ہے نہ ابلاغ کا فقدان۔ اپنے غیر روائتی طرز زندگی کو برحق جانتا ہوں اور اس کی سچائی پر اعتبار کرتا ہوں۔ میری سوچ انسانی علم اور معیاروں کے تابع ہے۔ ٹھیک ٹھاک زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کیا روائتی رشتوں کے کھو جانے کے بعد ایسا کوئی واضح تغیر قبول کیا گیا ہے جو آج کی ضروریات کو پورا کر سکے؟ نہیں! نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زبان روزمرہ کی زندگی میں ہماری آج کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ایک گونہ تشدد سے دو چار ہوگئی ہے۔ ایک طرف ملٹی لنگول ذرائع سے پیدا ہونے والا لسانی ملغوبہ مستعمل ہے تو دوسری جانب پرانے لسانی رابطوں کو توڑ پھوڑ کر نئے مزاج کی ضروریات کو ممکنہ حد تک پورا کیا جا رہا ہے۔ زبان سماجی افعال کی کارکردگی میں ایک تشدد برداشت کر رہی ہے، جو ہمارے ہاتھوں چند اینٹیں اور آ کھڑ گئیں تو قیامت نہیں آ جائے گی۔ حاشا وکلا مکمل انتشار اور دیوانگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہ تو روزمرہ کی بات ہوئی۔ شعر و ادب روزمرہ کے کاروبار کا دوسرا نام نہیں۔ اگر ہمارے پیش نظر محض تاجرانہ مسائل ہوں تو بھی لسانی حرمتوں کو توڑنا کچھ ایسا برا نہیں کہ زندگی اپنا رخ بدل چکی ہے۔ پھر میں تو شعر و ادب کی بات کرتا ہوں، تجارت کے

مُوڈ میں ہرگز نہیں !

وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ضرورتیں بدلتی ہیں۔ لیکن ضرورتیں جس رفتار سے تبدیل ہوتی ہیں عادتیں ان کا ساتھ نہیں دیتیں۔ وہ کافی دیر تک اپنی بے ڈھنگی چال چلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اسلوب زیست بدلنے کے باوجود ہماری روزمرہ کی زندگی اور ادب میں کچھ لسانی عادتیں اور رویے بوجوہ ابھی فعّال ہیں۔ پھر یوں بھی ہے کہ کچھ رویے ہمارے آج کے اسلوب زیست سے تشریح پا کر ہماری آج کی معنویت پر پورے اترتے ہیں۔ لسانی رویوں کی ان ہر دو باقیات سے ادب اور زندگی میں مفر نہیں۔ عبوری دور کی زحمتوں کے ساتھ یہ بھی سہی۔ کچھ عرصے کے بعد ہمارے اسلوب زیست سے مطابقت رکھنے والے رویے پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن جو لوگ ان باقیات پر رجعت قہقری کا مفروضہ قائم کرتے ہیں، ہدایت کی روشنی ان کے لیے نہیں، جہل کا استعارہ ہو تو ہو۔

جب ہم کوئی استعارہ استعمال کرتے ہیں تو وہ ہمیں ایک خبر، ایک خارج سے متعلق کرتا ہے۔ جب ہم بے جان کائنات سے روزمرہ کی زندگی میں ٹکراتے ہیں تو دیگر اعمال کے علاوہ لسانی رابطے پیدا کرتے ہیں۔ داخلیت سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔

گویا لسانی رابطے داخلیت اور خارجیت کا سنگھم ہیں !

ہم بے جان کائنات کو بدلتے ہیں، خود بھی تبدیل ہوتے ہیں اور بدلی ہوئی—بدلتی کائنات سے نباہ کرتے ہیں۔ بے جان کائنات اور بدلی ہوئی—بدلتی کائنات مزید رد عمل پیدا کرتی ہے اور تغیر و تبدل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ یہیں سے ان چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی ابتدا ہوتی ہے جو بعد میں مزید دریافتوں اور دانائیوں کی راہیں کھولتی ہیں۔ داخلیت اسی حوالے سے متعین ہوتی ہے، اور داخلیت کے ابتدائی سمبجات جو ترتیب پاتے ہیں اس کا سرچشمہ بھی انسان اور کائنات کا ٹکراؤ ہی ہے۔ یہ ابتدائی داخلیت اپنے طور پر مزید نمو پاتی ہے، بڑھتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، متخیلہ کے عمل سے، حدیں پھاند لیتی ہے۔ اس کا پھیلاؤ خودکار اور پروٹوپلازمک ! پورا نظام تلازمات پھیلتا ہے، تا آنکہ ابتدائی داخلیت سے متغیرہ، وسیع اور لا منتہی داخلیت تک کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ یوں ہماری ابتدائی داخلیت کا منبع تو انسان اور کائنات کا تصادم ہے، لیکن داغ بیل پڑنے کے بعد یہی داخلیت اپنے طور پر نشو و نما پانے لگتی ہے اور متخیلہ کے عمل سے اس میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق خارج سے منقطع ہو جاتا ہے : ابتدائی داخلیت کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ داخلیت کی اس انتہائی شکل اور وسعت سے ہمارا ظرف عہدہ برآ

نہیں ہو پاتا ۔ تہذیبی علامتیں اور علامتوں کے وسیلے سے مربوط کرنے والا نظام ساتھ چھوڑ دیتا ہے ، بھگتی اور دین الٰہی ایسی تحریکیں اور محمد حسین آزاد ایسی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ " فلسفۂ الٰہیات " میں زبان ریزہ ریزہ ہوگئی ہے ۔ موضوع پر گرفت نہیں ؛ جملوں کا آپس میں ربط نہیں ؛ خالص بے ترتیبی اور انتشار کا عالم ہے ۔ اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ایک شخصیت مختلف تہذیبوں کی علامتوں میں پھنسی ہوئی ہے ۔ کچھ بنانے ، کہنے اور متعین کرنے کی سعی ناتمام ہے ۔ سب کچھ ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہے : وسیع سے وسیع تر استعارے لڑھکتے ہیں ' زبان قواعد سے روگردان ہو چکی ہے ، بات کسی طور نہیں بنتی ۔ متغیرہ لا منتہی داخلیت نے ان کا ظرف پارہ پارہ کر دیا ہے اور وہ کربناک گھٹن اور بے بسی کے عالم میں ہیں ۔ ان کی بات ہم تک نہیں پہنچتی ۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے ۔ زبان ان کی نبوت کی تاب نہیں لاتی اور نبوت کو روزمرہ کی مفاہمت کا یارا نہیں ۔

محمد حسین آزاد اور ان کا عہد کیسے آشوب سے گذرے : مغلیہ سلطنت گئی ، آزادی کی پہلی تحریک مٹی ، گھر گھر ماتم ہوا ۔ جانے والے اپنے ساتھ ہماری ترتیب ، قدریں اور رہن سہن لے گیے ۔ اپنے پیچھے افسوس ، بے خانماں بربادی اور بے قدری چھوڑ گیے ۔ وہ گیے ، ان کے ساتھ وقت گیے ، وقتوں کے ساتھ ایک طرز سے زندگی کرنے کے اصول گیے ۔ ہم تنہا اور لاچار ہوئے ، سو اب تک ہیں ۔ بیچ میں لگ بھگ سو برس گذرتے ہیں ۔ ایک نئی تہذیب ، تعلیمی نظام اور طرز معاشرت کی ابتدا ہوتی ہے ۔ کچھ زخم مندمل ہوتے ہیں ، کچھ گھاؤ اور پڑتے ہیں ۔ افتاں و خیزاں بٹوارے کے حشر تک آ پہنچتے ہیں ۔ تہی دامنی پہلے بھی کچھ کم نہ تھی ، اب رہا سہا بھی جاتا رہا ۔ تشدد ، دہشت اور افراتفری نے پہلے سے بھی بڑھ کر رنگ دکھایا ۔ روائتی علامتیں اپنی تکمیلی حیثیت میں مذکورہ ترقی یافتہ ، متغیرہ اور لا منتہی داخلیت کے لیے پہلے ہی ناکافی تھیں ، قدریں بکھرنے اور تشدد سہنے کے بعد زبان بھی شکست و ریخت سے دوچار ہوئی ۔

آج جب ہم اپنے گرد و پیش سے متحارب ہوتے ہیں تو ہمیں ایک نوعیت کی داخلیت ملتی ہے ۔ دوسری نوعیت کی داخلیت ہمیں لسانی اور ادبی ذرائع سے بطور وراثت ملتی ہے ۔ اپنے خودکار اور پروٹوپلازمک عمل اور رد عمل سے ، باہمی تعامل سے اور متخیلہ کی زود اثری سے جو داخلیت مجموعی طور پر معرض وجود میں آتی ہے ، اسے سنبھالنے کے لیے زبان کہاں تک برقرار رہ سکتی ہے : اس کا تمام ڈھانچہ ذرہ ذرہ

ہونا تھا ' سو ہو رہا ہے ' ہوتا جائے گا - واویلے سے ضروریات ٹالی نہیں جا سکتیں - روائتی اسلوب ' صنائع بدائع ' ترکیب و ترتیب ' محاکات و تلازمات ضروریات کے مطابق ڈھل رہے ہیں ' ڈھلتے جائیں گے - کھردرا پن عارضی ہے ' مسلسل استعمال سے گھل مل جائے گا - زبان کا غیرمعمولی استعمال معمول بن جائے گا - محمد حسین آزاد کی استثنائی کیفیت ہماری شعوری گرفت میں ہے ' اس لیے زبان کے غیرمعمولی استعمال کو معمول قرار دینے میں ہمیں اچنبھا ہے ' نہ پشیمانی - زبان کے جھوٹے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ہم اپنی ذات سے منحرف نہیں ہو سکتے - ہماری ذات روائتی علامتوں اور مروجہ لسانی سانچوں میں نہیں ڈھلتی ' لامحالہ نام نہاد لسانی حرمتوں کو چیلنج کرنا ہوگا -

نام نہاد لسانی حرمتوں کو چیلنج کرنا قواعد والوں کو دعوت یلغار دینا ہے - اب یہ بھی ہو جائے - شعر و ادب پر کب تک گرامر والے حکمران رہیں گے - ان سے نجات حاصل کرنا ہی چاہیے - وہ زبان جو ادبی وراثت میں مختلف ادوار کی ٹھوکروں ' ترقیوں ' پابندیوں اور زیبائش و آرائش سے ' مختلف طبائع کی ہنگمہ پروری ' کور ذوقی یا خوش مذاقی سے ' تخریب ' تعمیر ' محنت ' دسترس ' نا رسائی ' کم فہمی اور ہیچمدانی سے ' اور سننے والوں کی اجتماعی تلازماتی کیفیتوں ' گرد و پیش کی رنگارنگیوں ' طوائف الملوکیوں ' پریشانیوں اور مختلف مقامی اور غیر ملکی وسیلوں ' امنگوں ' سانچوں ' لیوزتوں ' حکائتوں ' داستانوں اور ضرب المثلوں سے ہم تک پہنچی ہے اسے بعینہ برقرار نہیں رکھا جا سکتا - اس کھڑی دیوار کے نیچے سے سلیمان کو سنبھالنے والی دیمک خوردہ لاٹھی نکال لی جائے تو مختلف النوع فواید کی اشیا بکھر جائیں گی - چنانچہ لسانی طور پر جذب شدہ تمام مواد جب نئے سرے سے منظم ہوگا اور آج کی معنویت قبول کرے گا تو نئی راہیں کھلیں گی - نئی آواز اور پرانی سرگوشیوں کے ربط باہم سے جذبات کی لسانی حدود ایک نئی وسعت سے ہمکنار ہوں گی - کچھ لوگ آجکل کے مجرد تصورات سے آنکھیں موند کر لسانی حرمتوں کو چیلنج کرتے ہیں - وہ روائتی اسلوب زیست اور علم پر بھروسہ کرتے ہیں اور بنے بنائے جذبوں کو بہ ادنیٰ تغیر بیان کرتے ہیں - ان کی سماجی مفاہمتیں ' لسانی تعینات اور لسانی عادات روائتی اسلوب زلیست پر مبنی ہیں - ان کی کائنات کی تعبیر آجکل کے مجرد تصورات پر مبنی نہیں ' نامعلوم وہ کیسے لسانی حرمتوں کو چیلنج کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں ! ان کے لفظوں سے جو دنیا بنتی ہے وہ صدیوں کی جانی پہچانی' بنی بنائی' بیجان دنیا ہے - ہماری زندہ شناسائی کے رنگ کہیں

نظر نہیں آتے ۔ عوامی دانش ' احساس اور علم ہر زبان کے رگ و پے میں ہوتا ہے ۔ پھر تحصیل ' تسخیر اور تجربے سے اس ذخیرے میں انفرادی اضافے ہوتے ہیں ۔ ہر شخص ایک حد تک عوامی ذخیرے کا پابند ہو کر کہ ادب اور زندگی میں کچھ روایتی عادتیں اور لسانی رویے فعال رہتے ہیں ' ایک علیحدہ منطقہ بھی بناتا ہے جہاں اس کی پسند اور نا پسند کے واضح حاشیوں میں حقیقت کی تصویر ابھرتی ہے ۔ حقیقت کی یہ تصویر ہر ایک کے یہاں مختلف ہوتی ہے ۔ جو لوگ آجکل کے مجرد تصورات سے آنکھیں موند کر لسانی حرمتوں کو چیلنج کرتے ہیں ' عملاً یکرنگی کے شکار ہیں ۔ حقیقت کی یہ مختلف تصویر بھی ان کے یہاں نہیں ملتی ۔ معلوم ہوتا ہے ان کی پسند اور نا پسند بھی اپنی نہیں ۔ سب کچھ جدی پشتی ہے ۔ تراکیب کھول دینا آجکل کے مجرد تصورات کا نعم البدل نہیں ۔ یہ تو محض نام نہاد لسانی حرمتوں کو ہیر پھیر کے بعد قبول کرنا ہے ۔ عمل بدلتا ہے نتیجہ وہی رہتا ہے ۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ عمل بدلے نہ بدلے نتیجہ بدلے ۔ اس سلسلے میں بنیادی حیثیت مجرد تصورات کی ہے ' تراکیب کو کھولنے یا بند کرنے کی نہیں ۔ آجکل کے مجرد تصورات کے مطابق زبان کی تدوین کرنے کے لیے بنی بنائی زبان کو پہلے توڑنا ہوگا ۔ اس توڑ پھوڑ سے تھوڑا بہت انتشار بھی ہوگا ۔

مکمل انتشار سے خوفزدگی بجا ۔ پھر بھی تھوڑا بہت انتشار تو ضرور چاہیے ۔ انتشار کا مکمل فقدان گہما گہمی اور رنگا رنگی کی نفی ہے ' ایک قید ہے ۔ ایسی قید سے طبیعت گبھراتی ہے ۔ صدیوں سے مخصوص رابطوں میں بندھی ہوئی زندگی سخت قید ہے ۔ مجھے آزادی چاہیے ۔ تھوڑی ہی سہی ' بہر حال آزادی چاہیے ۔ اور وہ میں نے لی ہوئی ہے ۔ جبھی تو یہ تصور مجھ میں پیدا ہوا ہے ۔ جو آزادی میں چاہتا ہوں اس میں شدید جکڑ بند کی گنجائش نہیں ۔ فی الحال تھوڑا سا ' بالکل معمولی انتشار کام دے جائے گا ۔ میں چیزوں کو اس انتشار اور پھیلاؤ کے بغیر قبول نہیں کر سکتا ۔ جہاں تک میرا بس ہے میں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جد و جہد کرتا رہوں گا ۔ چیزیں متغیر ہوتی نظر آتی ہیں تو آئیں ۔ ترتیب گم ہوتی ہے تو ہو جائے ۔ رشتے درہم برہم ہوتے ہیں تو کیا ہوا ۔ اسی الٹ پلٹ ' انتشار ' پیچیدگی اور پھیلاؤ میں میری روحانی آبرو ہے ۔ میں یہ کام کیے جاؤں گا ۔ اپنی پریشان اور مضطرب دنیا کچھ ایسے ہی بنتی ہے ۔ جو ابلاغ اور ترسیل کو شعر و ادب میں دو اور دو چار کی طرح روا رکھتے ہیں ' بھاڑ میں جائیں ۔ میں اپنی بے ہیئت رگ و ریشے کی کائنات سے مطمئن ہوں ۔ یہ ہجوم کی ننھا نفسی کیفیت ' یہ پھیلاؤ ' یہ گھنی گنجلک دنیا اپنی پسند کی دنیا ہے ۔ اس کے پس منظر میں جھلکتی

تجرید اپنے اسلوب زیست کی نمائندہ ہے ' سو بھلی لگتی ہے ۔

ہمارے اسلوب زیست میں جو فضا کار فرما ہے ' وہ مجرد تصورات کی مرہون منت ہے ۔ ان تصورات نے انسان اور کائنات کے بارے میں ہماری تعبیریں بدل دی ہیں اور آج ہم اپنے رویے ' فیصلے ' پسند ' ناپسند اور عقیدے ان تصورات کی مطابقت سے اختیار کرتے ہیں اور کبھی محض اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ چنانچہ انسان اور کائنات کی بیشتر روائتی تعبیریں مغالطے دکھائی دیتی ہیں ۔ یہ مغالطے مجرد تصورات کے پورے عمل میں مزاحم ہوتے رہتے ہیں ' اور مجرد تصورات کی بدولت جو تجربات ہوتے ہیں ان کے خد و خال پوری طرح واضح نہیں ہونے دیتے ۔ تجربے سے ہم اس وقت آگاہ ہوتے ہیں جب یہ کسی لسانی ضابطے کا پابند ہو کر آئے ۔ کوئی تجربہ لسانی رابطوں کے بغیر ہم تک نہیں پہنچتا ۔ جب تک ہم اپنی ذات کے ارتعاش کو زبان و بیان کے وسیلے سے شخصیت نہ دیں ' تجربے کا ظہور نہیں ہوتا ۔ تجربہ اپنے ظہور میں معروضی لسانی بیان ہے ۔ لسانی بیان کے ذریعے لسانی عادات ' لسانی مفاہمتیں ' لسانی تعینات اور کائنات کی روائتی تعبیریں درآتی ہیں ۔ روائتی تعبیروں کو ہمارے مجرد تصورات مغالطے قرار دیتے ہیں ۔ چنانچہ ہمارے تازہ ارتعاشات معروضی لسانی شخصیت اختیار کرتے ہی گھسے پٹے مغالطے دکھائی دینے لگتے ہیں ۔ اسی لسانی عمل کی بدولت جدید فلسفہ اردو میں ترجمہ ہو کر تصوف کا مزا دینے لگتا ہے ۔ اس مزاحمت کا پوری طرح قلع قمع ممکن نہیں ۔ ایسے میں کیا ہم اپنے ارتعاشات کو فقط مغالطوں میں تبدیل کرتے رہیں گے کہ روایت کا تحفظ ہوتا رہے یا اپنی ذات سے بھی انصاف کرنے کی سعی کریں گے ۔ ادبی کٹھ ملاؤں کا جواب ظاہر ہے ۔ پھر بھی مطمئن ہوں کہ روزمرہ کی زندگی پر ان کی اجارہ داری نہیں ' ان کی وہاں کوئی پیش نہیں جاتی ۔

روزمرہ کی زندگی نئے مفاہیم کو جنم دیتی ہے ۔ نئی نئی دقتیں اور صورتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ بنے بنائے لسانی رابطے بیکار ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لسانی رابطے لے لیتے ہیں ۔ یہ زندگی کا عمل ہے کسی کے کہنے سننے کی بات نہیں ۔ بری بھلی ' چلتی رکتی زندگی اپنی ضرورتوں کی خود کفالت کرتی ہے ۔ زندگی کا سفر ہر لمحہ اپنی سمت متعین کرتا ہے ' سنوارتا ہے ' بگاڑتا ہے اور پھر سنوارنے میں لگ جاتا ہے ۔ اس دوران میں تازہ لسا' رابطے بروئے کار آتے ہیں ۔ ہر تازہ لسانی رابطہ لا محدودیت کا حامل ہوتا ہے ۔ ان گنت کرنیں اور لہریں اس میں مجتمع ہوتی ہیں ۔ یہ بے قابو تازہ لسا' [illegible] ابلاغ اور ترسیل کی دنیا میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے ۔ حسب ضرورت

تازہ لسانی رابطے کو تراش خراش کے بعد افادیت کی دنیا کا پرزہ بنا لیا جاتا ہے۔ روزمرہ کا کاروبار سہولت سے طے ہونے لگتا ہے۔ اس طرح روزمرہ کی زندگی نئے لسانوں رابطوں کی جنم بھومی اور قربان گاہ کے فرائض بیک وقت سرانجام دیتی ہے۔

کم و بیش یہی عمل ادب میں بھی ہوتا ہے۔ تخلیقی ' تازہ ' ہزار شیوہ لسانی رابطوں کے خلاف ابہام کے نعرے لگانے والے انہیں یک جہتی افادیت کی سطح پر لا کر بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی دو راہیں ہیں۔ اولاً یہ کہ سکہ بند زبان سے اجتناب کیا جائے۔ زبان کے سکہ بند ہونے کے معنی ایک وقت میں دریافت شدہ لسانی رابطوں پر قناعت کرنے اور بڑھتی پھلتی پھیلتی زندگی سے تعلق منقطع کرنے کے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ سکہ بند زبان پر تشدد کیا جائے اور یک جہت الفاظ کی جگہ تخلیقی' تازہ' ہزار شیوہ' گنجلک لسانی رابطے کام میں لائے جائیں۔ یعنی لسانی حرمتوں کو چیلنج کیا جائے۔

لسانی حرمتیں ایک اسلوب زیست سے جنم لیتی ہیں اور اسلوب زیست سماجی مفاہمتوں ' لسانی تعینات اور لسانی عادات کو ایک وحدت دیتا ہے۔ چونکہ یہ تمام عناصر ایک بحران کا شکار ہیں اس لیے ان کے پس پردہ اسلوب زیست اور اس کے حوالے سے لسانی حرمتیں اکھڑ چکی ہیں۔ انہیں چیلنج کرنے کی بجائے رد کرنا چاہیے کہ یہ حرمتیں نام نہاد ہیں ' عملاً ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ لڑھکتی ہوئی رکاوٹیں ہیں ' ہماری ذات کو گرفت میں لینے والی قوتیں نہیں۔ اصلی قوتوں کے مراکز ہماری نگہ سے اوجھل نہیں ' دور ہیں ' دوری کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ دقت نظر سے کام لے کر ان کے لمس سے بہرہ ور ہوا جا سکتا ہے۔ تجربے کو واردات کی شکل میں پایا جا سکتا ہے۔ تجربہ بطور معروضی لسانی بیان اور تجربہ بطور واردات دو مختلف چیزیں ہیں۔ تجربہ بطور معروضی لسانی بیان محاکمہ کی صورت رکھتا ہے ' مثلاً ظلم کی کیفیات سے ہم ظلم کے سیاق و سباق تک پہنچتے ہیں۔ درپردہ یہ فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ فلاں سیاق و سباق میں فلاں نوعیت کا عمل کیوں کر ظالمانہ ہے۔ اس طرح معروضی لسانی بیان ہمارے مخصوص فیصلوں اور اعتقادوں سے مربوط ہو کر محاکمہ بنتا ہے۔ شعر و ادب مخصوص لسانی رابطوں اور ضابطوں کی نمائندگی کرتے ہوئے فیصلوں اور اعتقادوں کے وسیلے سے محاکمے کی دنیا میں آ دھمکتے ہیں۔ گویا منطقی تعقل پسندانہ طرز فکر محاکموں کی سرشت میں ہے۔ محاکمے شعر و ادب میں منطقی تعقل پسندانہ طرز فکر سے تعرض کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن اس مجبوری کا دوسرا رخ اس کی تسخیر ہے: منطقی تعقل پسندانہ طرز فکر کو اپنے آپ میں جذب

کیا جائے' ادبی استعارے سے راہ و رسم بڑھائی جائے اور تجربہ بصیغہ واردات نئے خد و خال سے اُبھرنے دیا جائے۔

تجربہ بصیغہ واردات اپنا علیحدہ نظام رکھتا ہے ۔ اس کی بدولت پیدا ہونے والی لسانی حرمتیں مذکورہ نام نہاد حرمتوں سے علیحدہ حیثیت رکھتی ہیں ۔ روزمرہ کی زندگی اور ادب میں جو لسانی عادتیں اور رویے ابھی فعال ہیں ان کا اسی نظام سے تعلق ہے ۔ یہاں قواعد والوں کی رسائی نہیں ۔ یہ اپنی اساس اور ہیئت میں غیرمنطقی ہیں۔ ان میں ایک ایسے لسانی مقدمے کی کٹھن فارمیولیشن ہوتی ہے جو اپنی اصل میں سراسر غیرلسانی ہے ۔ غیر لسانی امور کی یہ دھندلی غیر منطقی فارمیولیشن جن جذباتی حرمتوں کو جنم دیتی ہے انہیں چیلنج کرنا سوآفات کے مقابلے پر جوئے شیر لانا ہے ۔ سعادت حسن منٹو کی غیر معروف کہانی " صاحب کرامات " اسی زمرے میں آتی ہے ۔

بادی النظر میں سعادت حسن منٹو نے اپنی کہانی " صاحب کرامات " میں دیہاتی سادہ لوحی کے عیار پیر فقیر کے ہاتھوں استحصال کو موضوع بنایا ہے : ایک جعلساز روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر چوہدری موجو کو اس کی مطلقہ بیوی بھاتاں سے پھر سے ملانے کے لیے برگزیدہ ہستی کا روپ دھارتا ہے ' مکر و ریا سے اس کی بیٹی جیناں اور بیوی بھاتاں کو ملوث کرتا ہے اور جاتے ہوئے اپنی مصنوعی داڑھی اور پٹے وہیں چھوڑ جاتا ہے ۔ چلتے چلتے یہ بھی خبر ہوتی ہے کہ جیناں ہوبہو اپنی ماں کی شبیہ ہے اور خوبصورتی ماں بیٹی دونوں کے ایے متدر ہے ۔ چوہدری موجو صاف دل کا دیہاتی ہے ' اس نے معمولی سی بات پر غصے میں آ کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ طلاق دینے کے دوسرے ہی دن اسے اپنی اس حرکت پر ندامت اور پشیمانی ہوئی لیکن پچھتاوے سے کیا ہو سکتا تھا ۔ جب صاحب کرامات پیر صاحب کو ان حالات سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے کہا : " اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے ۔ وہ بڑا رحیم ہے ' بڑا کریم ہے ۔ وہ چاہے تو ہر بگڑی بنا سکتا ہے ۔ اس کا حکم ہوا تو یہ حقیر فقیر ہی تیری نجات کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا ۔" چونکہ چوہدری موجو سادہ لوح دیہاتی ہونے کے سبب انجانی معجزاتی کیفیتوں کا قایل تھا ' اس نے پیر کو خیر و برکت کا ظہور جانا اور دل و جان سے ان کا فرماں بردار ہوگیا ۔ پیر اپنی حقیقت پر بھی ظہور کا لبادہ اوڑھتا ہے ۔ پھر شراب کا مٹکا بھی موجود ہے ۔ صاحب کرامات کئی کٹورے شراب کے نوش جان کرنے کے بعد اپنے ہر دو متعلقات کو بھی اس رقی کے طور پر پلاتے ہیں ۔ بدمستی اور بے ہوشی کے عالم میں وہ دو مرتبہ جنت دکھاتے

ہیں ۔ دونوں مرتبہ شراب بطور کنڈیشن پریسی ڈنٹ اس عمل کے منظرنامے میں شامل ہے ۔ سادگی ' شرافت اور عفت و پاکیزگی کا جعل و فریب سے مجروح ہونا ہمیں کئی طرح سے متاثر کرتا ہے ! متنوع تاثر اس لیے کہ کہانی اپنے تارو پود اور درو بست کے مطابقت سے انتہا کو پہنچتی ہے ' اخلاقی اور جذباتی ججمنٹ کے لحاظ سے نہیں ۔

یہ تارو پود اور درو بست کی منطق سے مطابقت رکھتی ہوئی انتہا ' اخلاقی اور جذباتی ججمنٹ کے معنوں میں مکمل کیوں نہیں ؟ اس نامامیت کے پس منظر میں کئی عناصر گڈمڈ ہوگیے ہیں ۔ چوہدری موجو مذہبی آدمی تھا ۔ اس کے دل میں اس ذات پاک کا خوف تھا مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا ۔ پچھلے برس جب اس کے دوست دینو کا جوان لڑکا مر گیا تو اس کو قبر میں آتار کر اس نے بڑے مؤثر انداز میں کہا تھا : ہائے کیا شیں جوان لڑکا تھا ۔ دینو یار ' تجھ پر آج قیامت کا دن ہے ۔ تو کبھی یہ صدمہ نہیں برداشت کرے گا ۔ یارو اسے مر جانا چاہیے تھا ۔ ایسا شیں جوان لڑکا ' ایسا خوبصورت گبھرو جوان ۔ نیتی سنیاری جیسی سندر اور ہٹیلی ناری اس کو قابو کرنے کے لیے تعویذ دھاگے کراتی رہی ۔ مگر بھئی مرحبا ہے دینو ' تیرا لڑکا لنگوٹ کا پکا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جوانا موت کا یہ تذکرہ لرزہ خیزی کے سوا بظاہر کسی اور طرح کھپتا نہیں ۔

پھر صاحب کرامات نے چوہدری موجو کو خوشخبری سنائی کہ انہیں راستہ مل گیا ہے اور وہ ابھی جا کر اپنی بیوی کو لے آئے ۔ موجو اپنی بیوی لانے کے لیے فوراً تیار ہوگیا اور جاتے ہوئے اپنی بیٹی کو خدمت گذاری کی تاکید بھی کرتا گیا ۔ جب جیناں کام سے فارغ ہوگئی تو انہوں نے کہا : " جیناں دیکھو۔۔۔وضو کرو۔ "

جیناں نے بڑے بھولپن سے جواب دیا : " مجھے نہیں آتا مولوی جی ۔"

مولوی صاحب نے بڑے پیار سے سرزنش کی : " وضو کرنا نہیں آتا ۔ کیا جواب دوگی اللہ کو ؟ " یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اس کو وضو کرایا اور ساتھ ساتھ اس انداز سے سمجھاتے رہے کہ وہ اس کے بدن کے ایک ایک کونے کھدرے کو جھانک جھانک کر دیکھ سکیں ۔

وضو کرانے کے بعد مولوی صاحب نے جائے نماز مانگی ۔ وہ نہ ملی تو پھر ڈانٹا ۔ کھیس منگوایا اس کو اندر کی کوٹھڑی میں بچھایا اور جیناں سے کہا کہ گھڑا اور کٹورا اٹھا کے اندر لے آئے ۔ وہ لے آئی ۔ مولوی صاحب نے آدھا کٹورا پیا اور آدھا

اپنے سامنے رکھ لیا اور تسبیح پھیرنا شروع کر دی۔ جیناں ان کے پاس خاموش بیٹھی رہی۔

بہت دیر تک مولوی صاحب آنکھیں بند کیے اسی طرح وظیفہ کرتے رہے ' پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کٹورا جو آدھا بھرا تھا ' اس میں تین پھونکیں ماریں اور جیناں کی طرف بڑھا دیا : " پی جاؤ اسے !"

جیناں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں محسوس کیا کہ وہ کسی بے داڑھی مونچھ والے جوان مرد کی گود میں ہے اور وہ اسے جنت دکھانے لے جا رہا ہے۔

یوں خرقۂ سالوس سے برآمد ہونے والا جوان مرد ' لحد میں اترنے والے دینو کے بیٹے سے جنت کے لسانی رابطے کی بدولت منسلک ہے کہ اس موقع پر چوھدری موجو نے کہا تھا : " مگر بھئی مرحبا ہے دینو ' تیرا لڑکا لنگوٹ کا پکا رہا—خدا کرے اس کو جنت میں سب سے خوبصورت حور ملے اور وہاں بھی لنگوٹ کا پکا رہے۔ اللہ میاں خوش ہو کر اس پر اپنی اور رحمتیں نازل کرے گا۔ آمین " ------ یہی نہیں ' جب جیناں بیدار ہوئی تو اسے سب کچھ دھند میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ وہ پھر سونے لگی۔ لیکن ایک دم اٹھ بیٹھی۔ مولوی صاحب کہاں تھے ؟ اور وہ جنت۔ اس نے باہر کل کر دیکھا تو دن ڈھل رہا تھا اور مولوی صاحب وضو کر رہے تھے۔ جیناں واپس کوٹھڑی میں چلی گئی اور کھیس پر بیٹھ کر اپنی ماں کے متعلق سوچنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نمودار ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گیے : " مجھے تمہارے باپ کے لیے ایک وظیفہ کرنا ہے—ساری رات کسی قبر کے پاس بیٹھنا ہوگا—صبح آ جاؤں گا— تمہارے لیے بھی دعا مانگوں گا۔"

کہانی کی اخلاقی اور جذباتی ججمنٹ کی ناتمامیت کا موت اور جنت کے ملحقہ کنائے ' جن کے تلازماتی لاحقے سعادت حسن منٹو نے اپنی بصیرت سے متعین کیے ہیں ' اور چھوٹی چھوٹی بظاہر بکھری لیکن فی الاصل منضبط تفاصیل مثلاً کیفیتِ سکر ' دن کا ڈھلنا ' پاکیزگی بوسیلہ وضو ' کھیس پر کہ جائے نماز کا متبادل ہے شراب نوشی ' شراب کا تین پھونکوں سے متبرک کیا جانا اور کھیس پر ہی جنت تک رسائی ' قبر پر وظیفہ ' قبر میں اتارے ہوئے جنت اور لنگوٹ کا اکٹھا ذکر اور جیناں کا اپنی ماں کو بعدہٗ یاد کرنا ' جس مواد سے رشتہ استوار کرتی ہیں ان کا کلّی احاطہ اس ناتمامیت کا رنگ گہرا کرتا ہے۔ یہ ناتمامیت ان وسیع معنوں سے مشتق ہے جو کسی طور لسانی رابطوں کی شدید گرفت میں نہیں آتے ' جو اپنی حد میں لاینحل اور بے اعتبار ہیں۔

بار ہا ایسا ہوا ہے کہ ایک وقت کی کامیاب کوششیں چشم زدن میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی تفسیر بن گئیں ' لسانی رابطے بیکار ہوئے اور پلک جھپک میں عزت و آبرو والے بے اعتبار ٹھہرے - ہمارا روائتی ادب اسی آشوب سے دو چار ہے - ناتمامیت جس تمام و کمال کو مسلّم مفروضے کے طور پر قبول کر کے لسانی رابطوں کو بروئے کار لاتی تھی ' آج وہ تمام و کمال بمنزلہ ایک بے مغز چچوری ہوئی ہڈی کے ہے ' اس لیے انسانی ذات کو گرفت میں لینے والے ناتمامیت کے وہ لسانی رابطے جو بزرگوں کے لیے کافی و شافی تھے ہمارے لیے بیکار ہیں - ہمارا تمام و کمال کا مفروضہ مختلف ہے - ہماری ناتمامیت اور اس ناتمامیت سے پیدا شدہ لسانی رابطے جس مسلک کے آئنہ دار ہیں اس کا رنگ و رامش سواد حاضر سے متعلق ہے -

دینو کے بیٹے کی جوانا موت جو پہلے کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی مختلف تفاصیل دیکھنے کے بعد پوری کہانی سے ایک حد تک ہم آہنگ ہو جاتی ہے - بنیادی کنائے موت اور جنت کے ہیں - موت اور جنت کے یہ کنائے پوری کہانی کے رگ و پے میں ہیں - چنانچہ جب مولوی صاحب وظیفہ کر کے لوٹتے ہیں تو اس وقت بھی جیناں کچھ انہیں امور کے بارے میں سوچ رہی ہوتی ہے : "اس کو اپنے باپ کا انتظار بھی تھا - جس کو اس وقت پہنچ جانا چاہیے تھا - ماں سے بچھڑے ہوئے اس کو دو برس ہو چکے تھے - - - اور جنت - - - وہ جنت - - - کیسی تھی وہ جنت!! - - - کیا وہ مولوی صاحب تھے ؟ مگر اس کو دھندلا سا خیال تھا کہ وہ آدمی داڑھی والا نہیں تھا ' کوئی جوان تھا "- جیناں جب بھی جنت کا سوچتی ہے ' اسے اپنی ماں یاد آتی ہے ' ماں کی یاد اسے جنت کے خیالوں کی دنیا میں لے جاتی ہے - جیناں کی جنت اور جیناں کی ماں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہیں - پھر یہ جنت دینو کے جوان مرگ ' لنگوٹ کے پکے ' شیں جوان گبھرو کو چھوتی ہوئی موت کی وادی میں چلی جاتی ہے - جنت ' جوانی اور موت اس مقام پر دھندلے دھندلے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں -

چوہدری موجو اور پھاتاں کو پھر سے ملانے کے لیے صاحب کرامات پھاتاں سے ایک رات کے لیے نکاح اور طلاق کا سلسلہ کرتے ہیں - چنانچہ اگلی صبح جب موجو اور اس کی بیٹی لوٹتے ہیں تو مولوی صاحب جا چکے ہوتے ہیں - پھاتاں صحن میں سو رہی ہوتی ہے ' موجو اسے جگاتا ہے - وہ بڑ بڑاتی ہے : " جنت - - - جنت "-
جنت کے حوالے سے پھاتاں بھی اسی گنجلک در آویختہ دنیا میں داخل ہو جاتی ہے -

ان نرم و نازک رشتوں میں بندھی ہوئی ناتمامیت کی یہ داستان جس چھوٹی موٹی فیبرک کو ہماری ذات سے ہمکنار کرتی ہے ' اس کا توازن بہت کومل اور پُر اسرار ہے۔ موت اور جنت کے کنائے ماں بیٹی کو چپکے چپکے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں: ایک یکساں مقدر ' ایک ازلی تنہائی ' اپنے سے بڑی دنیا کا سراب: جنت! سب کچھ گھل مل کر نئی شخصیت اختیار کرتا ہے ' کئی منزلیں طے ہو جاتی ہیں اور خاموشی کے ہالے میں حرف ممنوعہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ حرف ممنوعہ حرمت کے زیر سایہ کھٹکتا تو ہے ' لیکن اپنا نام نہیں رکھنے دیتا کہ کہیں شناخت نہ ہوجائے۔ حرف ممنوعہ کا شناخت نہ کیا جانا ' شناخت کی حد سے پرے رہنا ' حرمت کا استدلال ہے۔ حرمت اسے حرف ممنوعہ بناتی ہے۔ حرف ممنوعہ لسانی ناتمامیت کا جواز بنتا ہے ' اور در پردہ اپنا اظہار کرتا ہے۔

چونکہ اس کہانی کے مندرجات اپنی انتہائی حد میں کسی لسانی رابطے کی گرفت میں نہیں آسکتے ' اس لیے کہانی کے اندر تھرکتی سیابی کیفیت کا کماحقہٗ مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر لسانی رابطہ اپنے مواد کے قریب قریب پہنچنے کے باوجود بالآخر ناتمام رہتا ہے۔ ان معنوں میں "صاحب کرامات" ایک لسانی رابطہ ہے ' اور اس حقیقت کا جو تمام و کمال ہے محض ایک ادنیٰ اشارہ ہے: سمٹتا چھوٹی موئی عکس لرزاں! جس معکوس صورت کو یہ لسانی رابطہ ہمارے روبرو لاتا ہے اس کی کمیت ناپیدا کنار کو ہم قیاسی طور پر جان سکتے ہیں۔ یہ مبنی بر قیاس اشارے ' نشان اور نقاط ہیں اس کمیتِ ناپیدا کنار کے ' جو بوجوہ حرمت و حرف ممنوعہ کے ' ناتمامیت کی غلام گردش میں سرگرداں ہیں۔ انہیں محسوس کیا جا سکتا ہے ' اندازاً پہچانا جا سکتا ہے ' کماحقہٗ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ ان کہے ' گویائی کو روندتے ہوئے مندرجات سعادت حسن منٹو نے "صاحب کرامات" میں اکٹھے کئے ہیں اور انہیں ایک شکل و صورت عطا کی ہے۔ یہ شکل و صورت ایک ایسی جذباتی حرمت کا نام نامی ہے جو اپنی اصل میں نام قبول نہیں کرتی ' اس مواد کی ترتیب ہے جو حرمت و ناتمامیت کے سبب پوری طرح کہا ہی نہیں جا سکتا۔ "صاحب کرامات" میں ایک ایسا لسانی مقدمہ دھڑکتا ہے جو گویائی کے ہر قالب کو ٹھکراتا ہے ' ناتمام رہتا ہے کہ ان احساسات سے عبارت ہے جنہیں معکوسی ' دھندلے اور غیر منطقی ربط و ضبط اور بالواسطہ لمس ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کی شبیہ دوبدو گفتگو نہیں کرتی ' دائیں بائیں سے چھچھلتی پھسلتی درجۂ شہود رکھتی ہے۔ ہم اسے مظاہر کی ہزار داستان کائنات سے ملا کر پہچانتے ہیں۔ یہی نہیں '

ایک مرتبہ کی پہچان ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی ۔ ادھر اعتبار آیا کہ پہچان ہوئی تو بے اعتباری شروع ہوئی ' اچھا بھلا خواب پھسل گیا ۔ لاکھ چاہیں کہ اس کی بازیافت ہو' کام نہیں بنتا ۔ بھولتا خواب بھول ہی جاتا ہے ۔ لمحہ بھر کی گرفت عمر بھر کے زیاں کی راہیں کھولتی ہے ۔ ان راہوں سے غیر لسانی خواب نہیں لوٹتے ۔ کم مائیگی اور بیچارگی کی ہوائیں آتی ہیں ' نہیں آتے تو خوابوں کے لسانی مقدمات نہیں آتے۔

وہ معیار جو لسانی رابطوں کے پابند ہوتے ہیں ہمیں اس لیے پسند آتے ہیں کہ انہیں باآسانی ذہنی طور پر استعمال کیا سکتا ہے ۔ یہ آسانی مذکورہ لسانی مقدمات کے سلسلے میں مفقود ہے ۔ بلکہ ہر لسانی مقدمہ اپنی اصل میں غیر لسانی ہونے کی وجہ سے استعمال پذیری کی ضد ہے ۔ یہ ضد اس کی دھندلی فارمیولیشن کو بھی کٹھن اور دشوار بنا دیتی ہے! یہ دشواری انہیں سمجھ میں آسکتی ہے جو چھپی ہوئی ' ہمارے احساسات کو توڑتی مروڑتی اور خوفناک حرمتوں کے داخلی مواد کو پا چکے ہوں ۔ جن کی انتہا باآسانی استعمال کیے جانے والے لسانی رابطے ہوں' انہیں معذور ہی جاننا چاہیے ۔ "صاحب کرامات" ایک ایسے لسانی مقدمے کی فارمیولیشن ہے جس سے بھرپور معنویت ' تاثر انگیزی اور خوفناک جذباتی تصادم و اتصال کی بارڈ و تھوڈل مرتب ہوتی ہے ۔ اس فرد میں گریزاں ' لرزاں اور ناپائدار لذت و خوف کے سایوں کی آمدورفت اور متلون کھلتے سمٹتے کردار کا رقص شرر درج ہے ۔ چنانچہ جب مولوی صاحب داڑھی اور پٹے چھوڑ کر چلے گئے تو چوھدری موجو کے بےلوث ذہن میں ایک خیال آیا : " جیناں ۔ ۔ ۔ بھاتاں تم نہیں سمجھیں ۔ وہ کوئی کرامات والے بزرگ تھے ۔ ہمارا کام کرگئے اور یہ نشانی چھوڑ گئے "۔ ۔ ۔ ۔ " میں اب نماز پڑھنا سیکھوں گا اور اس بزرگ کے لیے دعا کیا کروں گا جس نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا "۔

بھاتاں خاموش رہی۔

اس خاموشی سے اس لسانی مقدمے کے سوتے پھوٹتے ہیں جو حرمت و ناتمامیت کو سمیٹے ہوئے حرف ممنوعہ کا طواف کرتا ہے ' اور کہانی اخلاقی اور جذباتی ججمنٹ کے معنوں میں اپنی انتہا کو نہیں پہنچتی ۔ ان امور کی نشاندھی کے ساتھ ساتھ ہماری جانچ پرکھ کے معیار بھی قلب ہیئت سے دوچار ہوتے ہیں ۔ ادب جو لسانی مقدمات سے متعلق ہو اس کا سراغ ' جائزہ اور قدر و قیمت اس امر میں مخفی ہے کہ وہ فارمیولیشن کے جملہ منطقی تقاضوں کو کس حد تک پس پشت ڈالتا ہے ۔ ان معنوں میں سعادت حسن منٹو کا فن ہماری آج کل کی وژن کا حصہ ہے ۔ جو فن ہماری قدر و قیمت کے معیاروں کو تبدیل کر

دے' سعادت حسن منٹو سے علیحدگی میں قائم نہیں ہوتا ۔ پھر انسان کی جان پہچان کے لیے جو مقامِ نظر سعادت حسن منٹو نے متعین کیا ہے وہ ہمارا مقدر اور ہماری روح کا تجربہ ہے : ہیبانک ۔ خوفناک اور سراسر انسانی! وہ جو سعادت حسن منٹو کا رد عمل بنتے ہیں ' بدگمان ہیں! بےشک بدگمان ہیں کہ اپنی روح کے تجربے سے منحرف ہوتے ہیں ۔ میں افسوس کرتا ہوں اور یرمیاہ نبی کا کلام یاد کرتا ہوں کہ قیدار میں قاصد بھیج کر دریافت کرو کہ ایسی بات کہیں ہوئی ہے ۔ کیا کسی قوم نے اپنے معبودوں کو حالانکہ وہ خدا نہیں بدل ڈالا! پر میری قوم نے اپنے جلال کے بے فایدہ چیز سے بدلا ۔

اگر سعادت حسن منٹو کی کہانی "صاحب کرامات" فعّال حرمتوں ' لسانی رویوں اور ہمارے مروجہ اصولوں کی توڑتی پھوڑتی ہے ' جملہ منطقی تقاضوں کو پس پشت ڈالتی ہے اور دیگر شکست و ریخت کے سامان پیدا کرتی ہے ' تو معیاروں کا معیار یہی بنتی ہے کہ مفرد استعارے کی بجائے ادبی استعارے کی رونمائی کرتی ہے ۔ استعارہ ہمیشہ طلوع ہوتا ہے : آہستہ آہستہ ' بتدریج! اس کی حدود سے لمحہ بھر میں پوری آگاہی نہیں ہوتی ۔ مختلف عناصر سے پیدا ہونے والی منتہی استعاراتی شکل اُن عناصر کو از سر نو متعین و مرتب کرتی ہے ۔ ان عناصر کی ابتدائی شکل منتہی استعاراتی شکل کی تخلیق کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے اور ان کا حدود اربعہ مختلف حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ عناصر اپنی تبدیل شدہ حالت میں جو وجود رکھتے ہیں وہ منتہی استعاراتی شکل سے علیحدگی میں ممکن نہیں : اُن کا وجود منتہی استعاراتی شکل کے زیرِ اثر اپنی اصل سے مختلف ہیئت حاصل کرتا ہے ۔

عناصر کی ابتدائی ہیئت اور منتہی استعاراتی شکل کی تخلیق کے بعد کی متغیّرہ ہیئت ' استعارے کے عمل کو واضح کرتی ہے ۔ استعارہ مختلف عناصر کا اجتماعِ محض نہیں کہ مختلف عناصر کو اکٹھا کر دیا جائے تو استعارہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ مختلف عناصر کو ان کی مشابہت کے ذریعہ اکٹھا کرنا منطقی تعقّل پسندانہ تجریدی سلسلہ ہے ۔ یہاں بنیادی مشابہت کو فکری طور پر اتنا ممیز کیا جاتا ہے کہ باقی مشابہتیں غائب ہو جاتی ہیں ' عناصر ایک رشتے میں بندھ جاتے ہیں' مطالب و مفاہیم مستقیم ہو جاتے ہیں ' ایک مشابہت دوسری مشابہت پر حاوی ہو کر جکڑ لیتی ہے اور بات بقیہ مشابہتوں سے ملوث نہیں ہونے دی جاتی ۔ استعارے کی بنیاد تجریدی مشابہت نہیں ۔ عملاً استعارے میں بیک وقت کئی مشابہتیں موجود ہوتی ہیں لیکن کوئی مشابہت اتنی ممیز نہیں ہوتی کہ بقیہ مشابہتیں غائب ہو جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک استعارے کے تمام عناصر

کو منطقی ربط دیا جائے تو استعارہ معنی کھو دیتا ہے اور ماحصل منطقی طور پر متضاد بیانات کا ڈھیر ہوتا ہے۔ منطقی طور پر متضاد بیانات استعارے کے باطن میں زندہ و اثر انگیز ہیئت پاتے ہیں۔ منطقی طور پر متضاد بیانات کے لیے استعارے کی مسیحا نفسی اسے بیان کے دیگر اسالیب پر فوقیت دیتی ہے کہ یہ اپنے دامن میں ہر نوعیت کے متصادم، متحارب، نامکمل اور غیرمنضبط طبقوں کو سمیٹ سکتا ہے۔ چنانچہ استعارے کے وسیلے سے کئی افراد کی جذباتی کشمکشوں کا بیک وقت احاطہ کرنا ممکن ہے۔ مختلف النوع زندگیوں کا تحارب، تصادم اور ناتمامیت سمیت ایک احساساتی منطقہ سامنے لانا، جہاں افراد کے ادغام سے کُل کا وجود ہو، چھوٹے بڑے ٹوٹے پھوٹے در آویختہ زاویے وصلِ تازہ سے جہانِ معنی کی اتنی کلّیت اور جامعیت سے تنظیم کریں کہ انسانی مقامِ نظر اس کے بدوں کیا ہے وا همہ رہے، استعارے کے دستِ قدرت میں ہے۔ اشیاء و حواس، زمان و مکان، کامیابی و نا رسائی اور ضمائر و افراد استعارے کے پانی میں غوطہ لگا کر اپنی جُون بدلتے ہیں: استعارہ سب کا اوا گون ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ استعاراتی رابطوں کو ایمپیریکل حقیقت پر بعینہٖ پورا اتارنا کیوں لازم ہے۔ ایمپیریکل حقیقت کو استعارے کے ذریعے متغیر و منقلب کیوں نہ ہونے دیا جائے۔ یوں بھی تو ایمپیریکل حقیقت سے تعرض برقرار رہے گا۔ مشکل یہ ہے کہ واردات کی دھائی دینے والے نہ تو تجربہ کو بطور معروضی لسانی بیان قبول کرتے ہیں اور نہ بطور واردات۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ارد گرد کی بنی بنائی تنقید سے نباہ نہیں ہوتا۔ ان دونوں وسیلوں سے جو دنیا ہمیں ملتی ہے وہ مروجہ روائتی دنیا سے ہر قدم پر اختلاف رکھتی ہے۔

یہ اختلاف ہمیں بہت عزیز ہے کہ ہماری بود و باش اور طرز احساس کی اساس ہے۔ البتہ اس مرحلے پر ایک اور دشواری پیدا ہوتی ہے۔ تجربہ کو معروضی لسانی بیان اور واردات میں تقسیم کرنے سے ایک ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ ثنویت چاہے مواد اور ہیئت میں ہو، چاہے معروضی لسانی بیان اور اس کے ہمزاد میں ہو، چاہے داخلیت اور خارجیت میں ہو، شعر و ادب کے لیے سود مند نہیں ہوتی۔

ایک ایسا مقام جہاں واقعات کا کوئی منضبط در و بست نہ ہو، چھوٹے بڑے، ٹوٹے پھوٹے، منتشر اور آوارہ اجزا سیدھی اور بالواسطہ گفتگو کی حد فاصل مٹا دیں، اور سب کچھ ایک مبہم ناقابل تشریح دھندلاہٹ کی آغوش میں چلا جائے، اپنا انت ہے۔ وہ دنیا جہاں ہر واقعہ، جذبہ، تصویر اور ترتیب مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی

ذہن میں تحلیل ہو جائے' شعری مواد اس تحلیل شدہ صورت میں اپنی اجنبیت اور تازگی سے بطور وقوعہ تخیّل میں سنسنائے تا آنکہ یہ وقوعہ متخیلہ کے سہارے فنی تجربہ بنے' کچھ اتنی عام نہیں - پھر بھی فنی تجربے کا یہ اسلوب اپنی اثر انگیزی میں یکتا ہے کہ اسے متخیلہ کی وسعت میں عمل کی دسترس ہے' اس سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے - اس ناقابلِ پیرافریز اور غیر ممیز مواد کی مختلف تعبیروں سے پریشان معنی ذہنی اندوختہ بنتے ہیں - یہ کیفیت شعری مواد سے علیحدگی میں نہیں جانی جا سکتی' یعنی شعری مواد اور معنی کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا - شعری مواد اور معنی کی یہ وحدت داخلیت اور خارجیت کی بے معنی تقسیم کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ اشیاء' واقعات اور جذبات کی متعین حدیں توڑ کر انہیں ایک نئے پس منظر میں لے جاتی ہے جہاں یہ سب کچھ تحلیل ہو جاتا ہے' اور شعری مواد سے باہر کوئی ایسا نقطۂ نظر نہیں رہ جاتا جس سے اس مواد کو پرکھا جا سکے - پھر تو یہ بھی نہیں جانا جا سکتا کہ کس نقطۂ نظر سے ان نام نہاد واقعات' اشیاء اور جذبات کو منتخب کیا گیا تھا - شعری مواد اور معنی کی یہ یکجائی جس لا شریک' خود مختار اور خود کار دنیا کو جنم دیتی ہے وہ اپنا معیار آپ ہے - یوں جب شعری مواد تکمیل پا جائے تو مبینہ واقعات' اشیاء اور جذبات اپنا آپ کھو کر پہلے سے مختلف ظہور پاتے ہیں' جسے بجز شعری مواد کے اور کسی حوالے سے جانچا یا پہچانا نہیں جا سکتا - شعری مواد کا یہ تصور خارجی حقیقت اور اس سے متعلق قواعد اور منطق کو اپنی مملکت میں پرسونا نان گریٹا گردانے پر ھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو علم و آگہی کا ایسا منفرد' مکمل' خالص اور خود مختار شعبہ قرار دیتا ہے جو قواعد اور منطق کی ضد ہے کہ احساس سے متعلق ہے - یہ علم اس خود مختار شعبے سے منہا نہیں جا سکتا' یہ اس کے باطن میں ہے - اسے کسی خارجی حقیقت کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا - بلکہ یہ خود سانچہ ہے' جس میں سب کچھ ڈھل کر ہمارے سامنے آتا ہے -

شعری مواد کے ابلاغ کے وسائل تجزیاتی نہیں - تجزیہ اپنی حقیقت میں چند اصولوں اور مفروضوں کو صحیح مان کر ان کے مطابق کسی مواد کے حصے بخرے کرتا ہے' چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو قائم کر کے ان کی قدرِ مشترک دریافت کرتا ہے' انہیں ربط دیتا ہے اور منظم کرتا ہے - یہ منظم صورت' چھوٹی اکائیوں کی اصولی شیرازہ بندی ہے - اس سے پیدا ہونے والی وحدت دیگر مشترک خصوصیات کی دریافت کے بعد ایک اور سلسلے میں منسلک ہو جاتی ہے - یہ ترتیب جاری رہتی ہے تا آنکہ منظم

فکری نظام مرتب ہو جاتا ہے ۔ تجزیے سے پیدا شدہ یہ نظام اصول اور مواد کی علیحدہ
علیحدہ حیثیتوں کو قبول کرتا ہے ' علاوہ ازیں تجزیہ شدہ مواد چھوٹی چھوٹی اکائیوں
میں بٹتا تو ہے لیکن ہر چھوٹی اکائی بطور اکائی اپنی ذات برقرار رکھتی ہے ' اس کے
کنارے واضح رہتے ہیں اور ہر اکائی دوسری اکائی سے بندھتی ہے ' اس میں مدغم
نہیں ہوتی ۔ داخلی اور خارجی حقیقت کی تخصیص موجود رہتی ہے ۔ شعری مواد ابلاغ
کے غیر تجزیاتی ذرائع سے سروکار رکھتا ہے ۔ یہ بہ حیثیت مجموعی ' تجزیہ کے برعکس '
ہمیں آ لیتا ہے ۔ اسے اکائیوں میں بانٹنا ' تہس نہس کرنے کے مصداق ہے ۔ اس کے
اجزا اپنی ذات برقرار نہیں رکھتے ' بلکہ کُل تحلیل شدہ کُل اپنی کلیّت میں بے نیاز ہے
جانچ پرکھ کے خارجی اصولوں اور مفروضوں سے ' معنی اور مواد کی ایک دوسرے سے
علیحدگی سے ' ہر اس چیز سے جو شعری مواد کی خود مختاری کو چیلنج کرے ۔ شعری
مواد کے معانی کو شاعر یا خارجی دنیا میں ڈھونڈنا بیکار ہے ' شعری مواد اور معنی
ایک ہیں ۔ اس لئے شعری مواد کو خارجی دنیا کا پر تو قرار دینا غلط اور خارجی دنیا
کی عکاسی کو ادب کا مقصد بنانا بے معنی ہے کہ شعری مواد قائم بالذات شعبہ ہے '
ذریعۂ اظہار نہیں ۔

ادب میں خارجی حقیقت انسانی ذہن کی زندہ آشنائی سے ماورا کیا ہے ! جو کچھ ہے اس
کا وجود ذہنی اندوختے پر منحصر ہے ۔ ذہنی اندوختہ متخیلہ کے تعامل سے باہر کی
خالص تصویر نہیں رہتا ۔ اس لئے جسے ہم خالص خارجی دنیا شمار کرتے ہیں فی الاصل
ہماری ذات کے کھوٹ سے مملو ہوتی ہے ۔ ہر ایک اپنی ذات سے خارجی دنیا سے ٹکراتا
ہے ' ہر ایک کا ذہنی اندوختہ مختلف ' اور اسی لحاظ سے متنازع فیہ خالص خارجی
دنیا جدا ہوتی ہے ۔ شعری مواد خارجی حقیقت کے تصور کو پاش پاش کرتا ہے ۔ پتہ ہی
نہیں چلتا کہ ادب میں واقعتاً خارجی حقیقت کیا ہے ۔ اپنے اپنے یک طرفہ فیصلے ہیں ' اور
کچھ بھی نہیں ۔ خارج کا ایک ہی تصور ممکن رہ جاتا ہے : وہ سب کچھ جس سے ذہن کی
زندہ آشنائی نہیں ' خارجی دنیا ہے ۔ یہ خارجی دنیا سائنس اور علوم کا موضوع ہو سکتی
ہے ' ہمارا آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں تا وقتیکہ یہ ذہن کی زندہ آشنائی کی منزلیں طے
نہ کر لے ۔ تو کیا شعری مواد اِس زندہ آشنائی سے بہرہ ور ذہنی اندوختے کا ذریعۂ اظہار
ہے ؟ نہیں ' شعری مواد ذریعۂ اظہار یا وسیلہ نہیں جس پر کوئی خیال یا جذبہ یا ذہنی
اندوختہ لاد کر پہنچایا جائے ۔ شعری مواد قائم بالذات شعبہ ہونے کی وجہ سے وسیلہ
اور اس پر باہر سے لادے جانے والے خیال یا جذبے یا ذہنی اندوختے سے پیدا ہونے

والی تقسیم' تخارب اور دوئی کو قبول نہیں کرتا ۔ جو لوگ شعری مواد کو کسی باہر کے ' شعری مواد سے علیحدہ ' خیال یا جذبے یا ذہنی اندوختے کی ترسیل کا آلہ یا ذریعہ سمجھتے ہیں ' مختلف بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ مثلاً وہ اکثر کہتے ہیں کہ خیال یا جذبہ یا ذہنی اندوختہ بعینہ قاری تک پہنچایا جانا چاہیے ۔ مفہوم کی ترسیل بعینہ جبھی ممکن ہے کہ قاری اور شاعر میں کچھ بنیادی مفاہمت ہو! شاعر کے مافیہ کی بعینہ ترسیل مروجہ ' لگے بندھے اور مسلسل استعمال شدہ حوالوں کو شرط اول قرار دیتی ہے ۔ اس لحاظ سے اولاً کوئی خیال نیا رہ ہی نہیں سکتا ۔ مروجہ ' لگے بندھے اور مسلسل استعمال شدہ حوالے اس کی گنجائش نہیں رہنے دیتے ۔ ثانیاً اگر خیال پہنچانے کے لئے آپ نے مفاہمت توڑ دی تو ابلاغ نہیں ہوگا ۔ لہذا اگر آپ شعری مواد کو کسی خیال یا جذبے یا ذہنی اندوختے کی ترسیل کا ذریعہ یا آلہ سمجھتے ہیں تو نئی بات کہنے کا خیال چھوڑ دیں ' وہی کہیں جو کہا جا چکا ہے ۔

بعینہ ترسیل کا فریضہ قواعد اور منطق کے زیر اثر لکھی ہوئی چیزیں بطریق احسن پورا کر سکتی ہیں کہ ان میں ترتیب ' تدوین اور تجزیہ کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں ۔ ایک حل یہ بھی ہے کہ آپ شعر و ادب چھوڑ کر قواعد اور منطق اپنا لیں ۔ خیال' جذبہ یا ذہنی اندوختہ بعینہ قاری تک پہنچتا رہے گا ۔ نامیاتی حس و حرکت کی خواہش البتہ ترک کرنا ہوگی ۔ نامیاتی حس و حرکت سے فیض یاب ہونے کے لئے تو شعری مواد کو بطور قائم بالذات شعبہ تسلیم کرنا ہوگا ۔ مواد اور معنی کی یہ وحدت ہیئت کا سوال بھی سامنے لاتی ہے ۔ شعری مواد اور فنی تجربہ اسی تقسیم کا شکار ہیں جو مواد اور معنی کے سلسلے میں جاری و ساری ہے ۔ بوچ چیزوں کو اسی تقسیم کے مد نظر قبول کیا اور کروایا جاتا ہے ۔ خالص ہیئت کے بے معنی تجربات کو بانس پر چڑھایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں تحریر فنی طور پر بہت خوب ہے ' واہ واہ ' سبحان اللہ ' موضوع اور مواد کے لحاظ سے کم اصل ہے تو کیا ہوا ! اب صورت یہ ہے کہ نہ تو ہیئت کے تجربات فاعلاتن فاعلات کے الٹ پھیر سے آگے بڑھ سکے ہیں اور نہ ہمیں بھرپور ادبی تخلیق دستیاب ہوئی ہے ۔

ہر ادبی تخلیق بتوسط تجرید حقیقی زندگی سے علیحدہ کی جاتی ہے ۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ یوں وہ مجرد مقام اپنے خد و خال سمیت واضح طور پر ہمارے سامنے آ جائے ۔ پھیلی ہوئی حقیقی زندگی میں بیشمار احتیاجات ایک دوسرے سے کندھے ملائے ہوئے انفرادی رنگ روپ کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں ۔ خصائص نکھرتے نہیں ' یکرنگی سی چھائی

وہ اسلوب زیست جو ہمارے آپ کے گھروں میں آ بسا ہے ' اجنبی ہے نہ غیر حقیقی۔ زندہ و توانا ہے۔ اس کی گمبھیرتا اس واویلے سے بھی متعین ہوتی ہے جو اس کے خلاف برپا ہے۔ روزانہ ایرے غیرے اور ثقہ بزرگ کچھ نہ کچھ کہتے ہی ہیں۔ بڑے عرصے سے کہہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ نیا اسلوب زیست بڑی تیز رفتاری سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ روکے سے رکتا نہیں ' تبدیل کرنے سے تبدیل نہیں ہوتا ' اپنی ہٹ کا پکا ہے: جیسے چاہتا ہے حاوی ہوتا ہے۔ خالص اور نا خالص چیخ و پکار رائیگاں جا رہی ہے۔ مجھے اس تغیر میں وہ قباحتیں بھی نظر نہیں آتیں جنہیں بزرگوں کی آنکھیں دیکھے بغیر ہی دیکھ لیتی ہیں ' ان کے گلے رندھ جاتے ہیں ' آواز بھراتی ہے اور واویلا ہوتا ہے ' واویلے سے تنقیح جذبات ہوتی ہے۔ اور بس! یہ واویلا کچھ نیا نہیں۔ جب سعادت حسن منٹو ہمیں دریافت کر رہے تھے ' یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ خاکے اور نقش جو سعادت حسن منٹو نے متعین کیے تھے اب کلیۃً حقیقی قوت کے مقام ہیں۔ ان مقاموں سے گزرنا کچھ لوگوں کے لئے اب بھی ممکن نہیں۔ ان کے لئے یاجوج ماجوج اور اصحاب کہف اپنے مقدر کی دیواروں اور غاروں میں فی الاصل اور بمطابق اصلِ اصول پابند ہیں ' ابھی تک کوئی تغیر برپا نہیں ہوا۔ حالانکہ ہماری زندگی جس قدر تغیر قبول کر چکی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جاننے کی سطح مستقیم باقی نہیں رہی۔ پہلے اشیاء کا ادراک منظم طریق پر کیا جاتا تھا۔ چیزیں ایک باضابطہ ترتیب میں بندھ جاتی تھیں۔ انہیں ایک زاویہ جان لینے کے بعد بآسانی پہچانا جا سکتا تھا۔ اب ہمارا علم کسی ایک سیدھی سمت میں نہیں بڑھتا۔ دیکھو تو ایک سرا نظر آتا ہے دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ سب کچھ گنجلک اور بے ترتیب ہے۔ بعض مقامات پر لاینحل! الٹی سیدھی سمت میں بڑھتی موجیں ایک دوسرے سے در آویزاں ہیں۔ آڑے ترچھے خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ بوقلموں پیچیدگی کا منظر ابھرتا ہے۔ پھر سے دیکھیں تو شوخ اور دھندلے رنگوں کا معمورہ ہے جس کی اپنی پلاسٹک ہیئت ہے۔

جذباتی طور پر ہماری دنیا کا جو نقشہ سعادت حسن منٹو نے مرتب کیا ہے اس میں روائتی قدروں کی شکست و ریخت بڑی واضح نظر آتی ہے۔ انسان اپنی عظمت کے نئے معیار پاتا ہے ' اور وہ خوفناک خلا جو روائتی قدروں کی منہائی کے بعد بظاہر پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے ' انسانی قدروں سے بخوبی پورا ہو جاتا ہے۔ وہ انسان جو روائتی معاشرے میں محض بدعت و قباحت ہو سکتا ہے ' سعادت حسن منٹو کے وسیلے سے احترام کی دنیا آباد کرتا ہے۔

ان تغیرات کی بدولت ہماری دنیا ہمارے بزرگوں کی دنیا سے مختلف ہے۔ بزرگوں کا علم، اسلوب زیست اور اخلاق و جذباتی آفاق جس منضبط ہائرارکی میں فرد اور کائنات کو باندھتے تھے وہ مفقود ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بے ترتیبی اور انتشار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مابعدالطبیعاتی ہائرارکی کے زوال کے بعد وہ ڈھانچے جنہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا لسانی عادات کے حوالے سے ابھی تک فعال ہیں۔ جو کچھ موجود ہے اس کی دریافت اور جانچ پرکھ اسی مابعدالطبیعاتی ہائرارکی کے حوالے سے کی جا رہی ہے۔ چیزیں پوری نہیں اترتیں اور یوں لگتا ہے جیسے نظم و ضبط کھو گیا ہے۔ خرابی یہ ہے کہ ہمارے معیار ابھی تک مابعدالطبیعاتی ہائرارکی سے نہج لیتے ہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا اور اُن قدروں کو جنہیں سعادت حسن منٹو نے متعین کیا ہے بطور رویہ قبول کرنا ہوگا۔

اس رویہ سے پیدا ہونے والی ترتیب تشریحی مابعدالطبیعاتی نظام سے پیدا ہونے والی ترتیب سے مختلف ہوگی: بظاہر انتشار ہی انتشار دکھائی دے گا۔

شعر و ادب ہمیں کائنات سے وصل کی کیفیت سے روشناس کراتا ہے۔ بقول ارنسٹ کیسیرر شعر و ادب میں ظاہری اور باطنی عناصر ایک اکائی کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یوں ہر لفظ امکانی طور پر ایک مقامِ نظر ہوتا ہے۔ ایک علامتی چوراہا، جہاں سے پوری کی پوری نظم کو پہچانا جا سکتا ہے۔ نظم کا ہر جزو اپنے اندر کُل رکھتا ہے۔ یہی ادبی استعارے کا مابہ الامتیاز ہے۔ استعارہ مجرد تصوراتی بیان کی ضد ہے۔ اس میں جاننے کی سطح مستقیم نہیں ہوتی۔ ہماری معروضی طور پر جاننے کی سطح پہلے ہی مابعدالطبیعاتی ہائرارکی کی منہائی کی وجہ سے مستقیم نہیں۔ پھر طریقِ کار، استعاراتی ہونے کی وجہ سے، از خود بھی خالص بیان کی حدود قبول نہیں کرتا۔ یوں ہمارے استعاراتی طریق کار سے پیدا ہونے والی پیچیدگی اور مابعدالطبیعاتی ہائرارکی کی منہائی سے پیدا ہونے والی پیچیدگی، پیچیدگی در پیچیدگی کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح منتشر و ویران آماجگاہ انسان و کائنات میں کوئی ترتیب پہچاننے کے لئے صبر و استقامت کے ساتھ ہفتخواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ خالص بیانیہ پورا نہیں اترتا۔ غیر ممیز اور پریشان فلکس کو قبول کرتے ہوئے افراد، محرکات اور سہیجات کی ملی جلی، ایک دوسرے میں گم اور پھنسی ہوئی دنیا کے تار و پود کو جگہ دینی پڑتی ہے۔ اشیاء اور لسانی رابطوں کی دوئی کو برطرف کر کے ابتدا و انتہا کو ایک ہی وقت میں گرفت میں لینا پڑتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ نئی ترتیب سے آنکھیں دو چار ہوئی

ہیں ۔ اشیاء اور ان کے بیان کی حد فاصل مٹ جاتی ہے اور واقعات آغاز و انتہا سمیت لسانی رابطوں کی ہیئت میں ' یکے بعد دیگرے کی بجائے اپنی فنی زندہ موجودگی میں ' گرد و پیش سے تخلیے میں ' علیحدہ و یکتا ظہور پاتے ہیں ۔ چونکہ یہ علیحدہ و یکتا ظہور بالآخر لفظ کے کالبد میں ہوتا ہے اس لئے ظہور سے بھرپور لفظ خود مختاری کا حامل ہو جاتا ہے ۔ مواد ' معنی اور ہیئت کی جگہ لفظ لے لیتا ہے ' اور روز مرہ کی کاروباری عملی زبان فنی خود مختار لفظ سے علیحدہ ہو جاتی ہے ۔ فن میں لفظ منبع و مرجع ہو جاتا ہے اور ادغامی ' کلّی اور ہمہ گیر کیفیت ظہور سے بھرپور لفظ کی منجمد دنیا میں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے ۔ لفظ بالترتیب بڑھتے ہوئے بیانیہ کا عنصر نہیں رہتا بلکہ بحوالہ مذکورہ ظہور اپنے آہنگِ خاص ' اپنی صوت ' اپنے مخصوص سیاق و سباق اور تلازمات سے بالترتیب بڑھتے ہوئے بیانیہ کو پائے استحقار سے ٹھکراتا ہے ۔ واقعات اور جذبات تحلیل ہو کر ' گرد و پیش سے انقطاع کے بعد ' انجماد قبول کر کے اپنے زمان و مکاں چھوڑ دیتے ہیں : ادبی تخلیق لسانی صنمیات بنتی ہے : ناقابلِ تحلیل ' ٹھوس ' ماورائے پیرا فریز !

لسانی صنمیات کی ناقابل تحلیل ' ٹھوس اور ماورائے پیرافریز ہیئت و ساخت میں حسیاتی امیج ' مجرد فکر ' جذبہ ' اخلاق ججمنٹ ' انسانی قدریں ' اسلوب زیست کے ابجد سے تمت تلک کے مرحلے کچھ اس طرح سے گندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں تجزیاتی ذرائع سے علیحدہ علیحدہ کیا جائے تو متذکرہ صدر مواد و معنی و ہیئت کے پس پردہ چھپی ہوئی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور صنمیاتی کانٹانسس جاتا رہتا ہے ۔ انمل بے جوڑ عناصر کا ملبہ شاعر اور قاری کے لئے مصیبت بن جاتا ہے ۔ اس لئے لسانی صنمیات کو تجزیاتی ذرائع سے توڑنے پھوڑنے سے احتراز لازم ہے ۔ تجزیاتی ذرائع سے شعر و ادب کی پرکھ میں وہی ایمپیریکل حقیقت لاگو کرنے کی سعی ہوتی ہے جو سائنسی اور منطقی طرز فکر کے رگ و پے میں ہے ۔ لسانی صنمیات کو معروضی دنیا کے تلازموں پر منطبق کرنا نہ صرف بہت سی قباحتوں کی بنیاد ہے بلکہ ایک نوعیت کی حد بندی بھی ہے ۔ اگر لسانی صنمیات کو خود مختار اور قایم بالذات رہنے دیں تو ان کے تال میل اور در و بست میں بے پناہ وسعت آ جاتی ہے ۔

چونکہ تجربہ بصیغہ واردات مجرد تصورات سے غائبانہ جہت لینے کے ساتھ ساتھ انہیں وسیع تر حوالوں سے ادبی استعاراتی لمس مہیا کر کے بغایت اہم اور منفرد انداز سے متاثر کرتا ہے ' اس لئے منطقی تعقل پسندانہ شعور غائب ہونے کی بجائے شدت سے اپنی موجودگی

کی مہر ثبت کرتا ہے' البتہ معروضی لسانی بیان کی محاکاتی قطعیت تحلیل ہو جاتی ہے۔ منطقی تعقل پسندانہ شعور کے دائرے پھیل کر دھندلاتے ہیں' دور ہو جاتے ہیں؛ اثر انداز بھر صورت ہوتے ہیں۔ منطقی تعقل پسندانہ شعور کو ادبی استعارے کے نظام میں سمونے کی کوشش اور خواہش اس کی ہستی کے اثبات سے جنم لیتی ہے۔ منطقی تعقل پسندانہ شعور انسان اور کائنات کی تقسیم در تقسیم سے پیدا ہونیوالی تجرید و تفہیم تک پہنچنے کے لئے معروضی اور داخلی حقیقت کے زاویے پیدا کرتا ہے۔ ان دونوں زاویوں کو ادبی استعارہ اپنی ذات میں ہم آہنگ کرتا ہے: معروضی و داخلی حد بندیوں کو پھاند کر ایک ایسا منطقہ وجود میں لاتا ہے جہاں یہ دونوں زاویے شیروشکر ہو جائیں۔ ان دونوں زاویوں کا وصل شاعر کی داخلی زندگی اور خارج کی معروضیت سے انقطاع پر منتج ہوتا ہے۔ تخلیقی لسانی کائنات اس وصل کی داستان کو لسانی صنمیات سے مستعار علامیوں میں بیان کرتی ہے۔ لسانی صنمیات شاعر اور خارجی دنیا سے منقطع ہونے کے بعد کس حوالے سے متعین ہو؟ تعین کا یہ مرحلہ پھر منطقی تعقل پسندانہ شعور کی طرف مراجعت کا' داخل خارج کی تقسیم کا' مواد و معنی کی دوئی کا' موضوع اور ذریعۂ اظہار کی ثنویت کا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ چنانچہ لسانی صنمیات کی ہر نئی تخلیق منطقی تعقل پسندانہ شعور کو نئے سرے سے نئے پس منظر میں چیلنج اور متحرک کرتی ہے' اس کے عمل کو وسعت دیتی ہے۔ منطقی تعقل پسندانہ شعور کی ہر نئی جست تازہ تجرید و تقسیم کو رو برو لاتی ہے۔ اس تازہ تجرید و تقسیم کو عبور کرنے کے لئے لسانی صنمیات سے وحدت بخش' محلول کانسپٹ پرسپٹ سمیٹنے والے اور ثنویت مٹانے والے علامیے مستعار لینے پڑتے ہیں۔ یوں منطقی تعقل پسندانہ شعور کے رد و قبول کا لامتناہی سلسلہ فنکار کو سلجھائے الجھائے رکھتا ہے۔ اس سلجھاؤ الجھاؤ میں سرخروئی کے چند لمحات وہی ہیں جب خود کار اور قایم بالذات ہیئت کی لسانی صنمیات سے روشنی پھوٹے اور زندگی کے خلا ہیولوں سے بھر جائیں۔ لسانی صنمیات اپنی خود مختاری میں جو جامۂ تخصیص اوڑھتی ہے' وہ اسے منطقی نظامِ فکر کی مانند مربوط نہیں ہونے دیتا۔ ہاں استعارہ در استعارہ لسانی صنمیات کا رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔ لسانی صنمیات کی استعاراتی ہائرارکی کی وسعت اور ہیولاتی حیثیت قیاس کی منزلیں طے نہیں کرتی' پھلانگتی ہے۔ استعاراتی ہائرارکی شعر و ادب کی اس خالص منزل کا نام ہے جہاں روز مرہ کی زندگی سے چنے ہوئے عناصر' کائنات اور فنکار کی شخصیت کھو جاتے ہیں' مادی و جذباتی حوالوں کی عکاسی نہیں رہتی' نئے زمین و آسمان پر نیا زیشن جلوہ افروز ہوتا ہے جو بے نیاز ہے' جس کا ہماری جانی پہچانی دنیا میں کوئی پرٹوٹائپ نہیں' کوئی رشتہ نہیں کہ اس کی آمد

سے نئے روز و شب ' نئی کائنات اور نئے آفاق کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے عکس پر نئے نقش بنتے ہیں۔ ان معنوں میں استعاراتی ھائرارکی عظیم تخصیصی تجرید ہے جو بتدریج بڑھتی ہوئی ہمارے جہان سے مختلف ایک ایسی کائنات تخلیق کرتی ہے جس کے معانی متعین نہیں کئے جا سکتے ۔

اس سلسلہ میں بقول چارلس فیڈلسن چند دشواریاں بھی ہیں :

The great danger of such an approach is not preciosity, as might be supposed, but intellectual suicide. There is only a slim margin of difference between a completely noncommittal and a nihilistic mood. Within that difference the problematic writer leads a precarious life, fostering the mutual criticism of reason and imagination and a provisional trust in both. He runs the danger of finding himself convinced by both and therefore unable to trust either. Yet even this impending fate can enter into his subject. The nemesis that hangs over him is also the final paradox which he must admit and turn to account—the possibility of the meaninglessness of meaning. In effect, he reaches, within his own frame of reference, the same sense of the ineluctable tension of human life as other put in terms of the distance between man and the super-natural. His God is the present reality of his work, the process that unifies all contradictions. His Devil is the potentiality of illusion and disunity. In so far as he suceeds, he is a kind of Manichee: his God comes into being by acknowledging the Devil. In so far as he fails, he allows the Devil to put an end to the meaningfulness of meaning ; the tragic theme of this work is the imminent loss of meaning which is the modern version of hell.

یہ کھیل ' لفظوں کا یہ کھیل جنت بخشے یا جہنم واصل کرے ' اب تو میاں کھیڈن آئیاں ئیں ۔

لاہور
مارچ ۱۹۶۳ء

افتخار جالب

۱

.... آنکھیں پیاسی ہیں
اور دھول ایسا رستوں میں بکھرا پھرتا ہوں
(محمد صفدر)

پھر تُو کس کے لئے....

پھر تو کس کے لئے دردِ گردونِ دوں کا مداوا
گرانباریٔ آرزو کی رگوں میں بہاتا رہے گا
شفاخانۂ جستجو کالی سڑکوں پہ روشن ستاروں کی زہریلی آنکھوں کی دہشت
میں جکڑا ہوا ہے
مریض اور مرض اور معالج پگھل پانی ہوتے کٹھالی میں ہیں
کون، کیا، کس کی تشخیص کر دے
سبھی کا بدن اور مرض اور مقام ایک ہے، لاکھ ہیں۔ آسماں کی نگاہیں!
نگاہوں کے آگے اجالا۔ اجالے کے چوگرد ہالہ۔ فقط ایک ہی ایک: وحدت
بکھرتی، اجڑتی، گنہگار کرتی، دوئی کی ہواؤں سے بالوں کو چھوتی
اٹے، بوالہوس روشنی سے بدن پونچھنے والے ہاتھوں میں رعشے کی بیچارگی
ہے، بھنور ہیں
ہوا، بکھرے بالوں کو حفظ مراتب کی ترغیب دے!
آتے جاتے کرشموں کی تحصیل کشکولِ شوقِ برہنہ کا مسلک نہیں
کوئی دریا کی لہروں پر رکتا نہیں
سنگریزوں کے پہلو چھلے جا رہے ہیں
ٹریفک کا ہنگامہ بڑھنے لگا ہے۔ تہیں ٹیڑھی سیدھی اتر جائیں گی
سخت، پتھر کا دل، ہر تغیر سے محفوظ دریا کے چھلنی بدن سے ابھر آئے گا
کول تار اور بجری سے چھلنی سڑک پھر سے پردہ کرے گی
تو دل خاکِ پا سے کہے گا: اے دوشیزہ اتنا بتا.... پر نہیں کہہ سکے گا

زمیں معذرت کی رگوں میں هوسناک تجرید کا خون بھرتی ھے ۔ نقش و نگار، اقتصاد و معاشِ دوئی ۔ دشت آغاز نیلوفری ۔ دھول، آنکھوں میں تاریکیاں ۔ صبح جاگی نہیں ۔ خواهشوں کے مقامات هیں ۔ کون تحریر کے درد جھیلے ۔ سیاهی سمندر، قلم انگلیاں ۔ اس کے لعلیں لبوں کی حکایات هیں ۔ آج کی رات وصلِ من و تو کی حدّت زدہ داستاں کہہ ۔ جدائی کے قصے بہت سن چکے، درد کی گرد کو لادوا چھوڑ دے ۔ اپنے خوابوں سے دوشیزگی کی علامت جگا ۔ میری اولاد بن اور زمیں پر فقیری کی چادر بچھا، آ ۔ مری راکھ سے کیمیا کا شرر، کہکشاں، میرا مطلب ھے، یعنی بہشت بریں هم نے چھوڑی نہیں تھی، نکالے گئے تھے . . . . بروئے روایت همیں آبرو کی خبر چاهئے ۔ کس کی همسائیگی، دوستی اور محبت کی دیوار پھاندیں؟ بتا، کس طرح بحرِ ظلمات کے نور سے بہرہ ور هوں

•

سائبان

مَیں خزاں میں گرفتار ہوں
دیکھو، خوابیدہ موجوں، خریدار روحوں
امڈتے سمٹتے زمانوں سے
ارض و سما کی سیاہی کا دامن نچوڑا ہے
لیکن ہواؤں کے وہم و گماں میں نہیں
کونسی خاک سے
قطرۂ آب، تابندہ موتی کی آغوش لیتا ہے
خواہش سے باہر نہ آؤں، مری ابتدا انتہا!
آج سوئے سمندر کی سلوٹ میں تابندگی ہے
سمندر کو پگھلا!
بتا، میرے سینے میں کس کس کی آواز ہے
کھیت میں گلہ بان مر چکا ہے
زمیں خونچکاں ہے
ستارے نہیں ہیں، فقط سائبان ہے

دُھند

روشن - روشن - روشن
آنکھیں یوں مرکوز ہوئی ہیں جیسے مَیں ہی مَیں ہوں .... مجھ میں
لاتعداد فسانے اور معانی ہیں - میں صدہا اسرار چھپائے پھرتا ہوں
میں خوش قسمت ہوں .... میرے ساتھ جہانِ رنگ و رعنائی ہے
اور دریچہ بند نہاں خانوں سے روحِ یزداں کی خوشبو اٹھتی ہے
میرا سرد مشام معطر کرتی ہے
اور مری تقدیر جہانِ خاق ہوئی ہے
جو ارمان کسی کے دل میں ہے ، مَیں اس کی خوشبو ہوں
واحسرت کا ارض و سما میں پھیلا نغمہ
جب محبوب تلک جا پہنچے
تو پھر میں آواز نہیں رہتا ہوں
اور نہ شریانوں میں بہتا خونِ خرابہ
بلکہ لفظ مطلق بن جاتا ہوں !
آنکھیں یوں مرکوز ہوئی ہیں جیسے مَیں ہی مَیں ہوں .... اور نہیں ہے کوئی
سچّی بات مگر اتنی ہے ، میں مردار سمندر ہوں
احساس زیاں کا جھونکا !
آنکھیں بول نہیں سکتی ہیں
اور بدن بینائی سے محروم ہوا ہے
لیکن ! میں تو اب تک خواب زدہ تصویریں دیکھ رہا ہوں

ماخذ

اور سمندر کے پربت پر ٹھہرا جنگل
بیتے گیتوں سے پُر جنگل

ازلی خاموشی کے ہالے میں تھر تھر کانپ رہا ہے۔ صدیاں ، سائے ، سوچ ، فصیلیں ۔ آمنّا صدّقنا ۔ ایلو! سورج چاند ستارے دھرتی کے سینے پر اترے ۔ میری راہگذر پر بکھرے ۔ ہلکی ، مدّھم اور مسلسل حرکت ۔ منزل بھول ، کنول کا پھول عدم کے بحرِ بے پایاں میں تنہا تنہا جھولے ۔ باہر پر مرکوز نگاہوں سے مخفی لفظ مطلق، تنہا اور اداس کنول پر جھلمل جھلمل پھوٹ بہا ۔ موہوم ردائے کوہ و دشت و دمن ، دنیائے من و تو پر چھائی ۔ پھیکی پھیکی ہو کر پھیل گئی ۔ دھول بنی ۔ اپنا گاؤں ، گوری کے پاؤں تک دھندلائے ۔ پہلی روشن اور نرالی دھند ، اور دھند ، اور دھند

پانی

مَیں دھرتی پر مست خرامی کرتا ، اپنے من کے درد و غم میں
حیراں حیراں سوچ رہا تھا
بکھرے بکھرے جانے پہچانے انجانے چہرے آنکھیں چوم رہے تھے
چیزوں میں کچھ روپ نہیں تھا ، بیزاری تھی
ــــقدرت کی آواز اچانک آڑے آئی ہو ، اور تحیر کے عالم میں صماً بکماً
اپنا آپ تلاش کروں ،
محروم رہوں ۔
جب میں گھوم رہا تھا ، ایک خلا تھا ۔ میں نابینا
رستہ ڈھونڈ رہا تھا ، آنکھیں پُوج رہا تھا ۔ آنکھیں ،
اپنی اور پرائی آنکھیں ، میری تیری ذات میں تھرتھر کانپ رہی تھیں
رات بھری شادابی سرخ افلاکی موج ابھر کر زرد ہوئی
میں کانپ اُٹھا

مایا جاگ پڑی تھی ۔ رات نہیں تھی ، دن تھا ۔ فلک کے روشن دست و بازو شیشے میں پابند عروسِ لالہ رخ سے حرفِ تمنا کہتے کہتے پھیل گئے تھے ۔ شفق کا غازہ شرم و حیا سے پوتّر ہو کر ہونٹوں پر شاداب تبسم کی مانند دمکتا ، میرے چہرے پر آ چمکا : ستارہ حرکت میں تھا ۔ انہوں نے نومولود کے آگے مُر ، لوبان ، جواہر رکھے ۔ پرستش کی ! تو خوابوں میں آگاہی ملی : اے لوگو ! ہیرودیس زمانہ ہے ، ہیرودیس زمانہ نہیں ہے ، مایا ہے : تہہ در تہہ ،

پُر پیچ ، عدم کی رونق سے آباد ۔ شفق کی موج سیاھی کی تقدیر جگانے آئی ہے ۔ جسم و جاں پر مل لو ، عقیدت سے جُھک جاؤ ۔ میں تعظیماً جامد لمحہ بن کر زرد ھوا۔ میرے تبسم کی شادابی جامد لمحہ کاٹ گئی : عورت مرد برابر۔ کانوں سے لال لہو نے باھر جھانکا ، مرد نے اندر دیکھا ۔ اسکا حجاب، مثالِ نور نرگس روح و رواں کو سینچ گیا ۔ مجھ میں مذکر اور مؤنث اپنا آپ تلاش کریں ، محروم رھیں۔ ھر سُو مایا ھی مایا ! دن تھا ، نگاھوں کے ریلے میں میرا تن من جل‌تھل جل‌تھل ، پانی پانی ! میری تشنہ آنکھیں پانی ، چہرے چیزیں چاروں کھونٹ امڈتے پانی ، بکھرے بکھرے سورج چاند ستارے پانی ، نغمے گیت پرستش پوجا پانی ، تنہائی خاموشی اور خدائی پانی ، صبحِ ازل سے شامِ ابد تک پانی ، پانی ، پانی

گرچہ تو گوہرِ نایاب ہوا

گرچہ تو گوہرِ نایاب ہوا
میں تجھے اپنے دل و جاں میں بسا کے بھی کوئی دعویٰ یکتائی نہیں رکھتا ہوں
اور بھی ہیں جنہیں یادوں میں فقط تیری عروسانہ جھلک ملتی ہے
لیکن کیا ہے
روشنی کتنے گدائی کے مراحل سے گذر لے تو کہیں ماہ شبِ چاردھم تک پہنچے
اور پھر سنگ و خزف چاند کی ہر لمحہ بکھرتی ہوئی زردی سے کریں
شوخ، بھڑکتے ہوئے رنگوں کی کشید
اور گہر بن کے ملیں، یا نہ ملیں
کون کسی کو جانے
پھر جو تو گوہرِ نایاب ہوا
میں تجھے اپنے دل و جاں میں بسا کے بھی کوئی دعویٰ یکتائی نہیں رکھتا ہوں

خوشبو

دیارِ محبوب کے قرائن سے پھُوٹتی روشنی کی خوشبو عجیب احساس کی امیں ہے
میں سدرۃالمنتہیٰ سے تحت الثریٰ تلک ہو کے لوٹ آیا
خبر نہیں اس مہک کا چشمہ کہاں چھپا ہے
اگر کبھی اس کے دست و بازو کا مرمریں مس
حیات بعد از ممات کی دھندلی آگہی کے عذار سے جل اٹھا
تو ذرّے کی ذات میں کائنات جلوہ نما ہوئی
اپنی جستجو کیلئے عجوزۂ آرزو صدھزار داماد ساتھ لیکر
طواف دوزخ کو چل پڑی
اس کی کوئی منزل نہیں ، سفر ہے
چلو ! جہانِ گریختہ پا کا فاصلہ طے کریں کہ تسخیرِ عرصۂ روشنی یہی ہے
یہیں ، جہنم کے ہفت درجات کے مناظر نگہ بدل کر
ابلتے سر ، شعلہ بار ساغر ، مہیب رخسار ، خوں چکیدہ بدن کی شاخیں لئے
سکوتِ عدم کی زیتون سے سجی وادیوں کو روح و رواں میں ڈالے چھپے
پڑے ہیں ....
اگر کبھی اسکے دست و بازو کے راز کا مرمریں تعلّق ، وجود آتش زدہ نے پایا
تو جسم وجاں میں چھُپی حرارت کا تیرہ چشمہ ابل پڑا ، رات جگمگائی
فنا کے گلزار کی بھری باس
بیستوں بن کے ذہن کے شیریں خواب کو چکناچور کرکے گذر گئی .....

تو مرا گماں
میں کہ بیکراں ہوں ، مرا کہیں خاتمہ نہیں ہے ، میں آسماں ہوں
میں بے زماں ہوں ، فقط تمنا کی بھول نکلی
وہ آگ آخر کہاں گئی ہے ؟ خبر نہیں ہے !
چلو ، پرائے مقام سے زندگی گذاریں ! ۰۰۰ . اگر شب و روز
دل کی گہرائیوں میں کھو کر صدا لگاؤں کہ میں کہاں ہوں
تو ہر تمنا گنہ میں بہہ کر مجھے جہنم میں لے چلے گی
نہ کوئی خوشبو ، نہ کوئی لذت
نہ جسم‌وجاں کے لئے زمہریر ، زلزلے ، ظلمتیں. . . . اجالے سے کیا کروں گا
بدن اجڑنے کی آرزو میں فنا ہوا ہے
وہ تیرہ چشمہ نگہ سے اوجھل ، کہیں تو ہوگا
دیار محبوب کے قرائن بتا رہے ہیں یہیں کہیں ہے ، مگر نہیں ہے
تو کوئی خوشبو سے کس طرح آرزو جگائے
میں کیا بتاؤں ، میں کیا بتاؤں ، میں کیا بتاؤں

پیلے ہاتھ ہیں

اسکے پاس کتابیں ، میز ، صراحی ، بستر
اور ٹرنکوں میں بوسیدہ کپڑے بھی تو تھے ، میں بھول گیا
سائے تن من ڈھانپ رہے تھے
زائر زندہ مردہ اپنا مقدر تیرتھ ڈھونڈ رہا تھا
اور زمین سینہ صحرا صحرا۔ ۔ ۔ ۔
لیکن روشن آنکھیں ، ہنستے چہرے ، محرومیاں اوڑھے ، بھول بھلیوں میں
بھٹکاتے پھرتے تھے
کوئی بول مدھر میٹھا سا ، تلخ احساس دلا کر ، پاکیزہ ناپاک سیاہی سانپ بناتا
گرداب سمٹتے کُھلتے ، لحظہ بھر کو
دیکھنے والا دیکھتا ، دیکھتا ، دیکھتا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ اس کی بات نہ پوچھو۔ صبح سویرے سورج دیکھتے ہی شرمانیوالا ستارہ اس کی نگاہوں میں رک جاتا ۔ بات بات پر آنکھیں جھپکتا ۔ کیسا موسم کا نظّارا تھا ! پھولوں کی بھرّائی آنکھیں ، ٹھہری ٹھہری جھیل کی جنتا ۔ ایک ہجوم ۔ اناج بہت مہنگا ہے ۔ کوئی ضیافت ہوگی ؟ جاؤ بھئی ۔ آج کسے فرصت ہے ، پھر دیکھا جائیگا ۔ میں نے کہا : بھائی ، تم کتنے دنوں سے سوتے جاگتے راتیں کاٹ رہے ہو ۔ کوئی حد ہوتی ہے ۔ پھر جو کہوگے ہم سے بھول ہوئی ہے ، جیسے بن پڑتا ہے اپنا معاملہ طے کر لو۔ ۔ ۔ ۔ اف توبہ ، ایسی بھی کیا جلدی ہے ۔ خواہشیں نس نس سے جھگڑا کرتی ہیں ۔ پیلے ہاتھ ہیں ۔ ڈر آتا ہے

منکہ امروز کی تحصیل میں ہوں

منکہ امروز کی تحصیل میں ہوں
شعلۂ تبلیغ نہیں ، لفظ کا ماقبل کہاں ، بعد کی مجبوریٔ بے شوق و حضور!
آج فقط خامشی ہے - بات نہیں، بات کا مفہوم نہیں - روز ملاقات ، سجی مسندیں، گلہائے عقیدت کی منڈھی بیلیں ، شگفتن سے لگا مرحلۂ شرحِ صدر - معنی و الفاظ کی بیگانگی - افسوس! سرِ شام بہاروں کی عنایات کے سو وعدے : بتا آج تلک میرا چلن بدلا ہے
چپ چاپ نفخ پھونکتی انگشت شہادت سے
درِ معنیٔ مدھوش پہ خاموش لکیروں کا درو بست
سیہ مدّ و جذر بانٹتا ہے !
دیکھ ، میں ان قحط کے ایام سے مجبور نہیں - اپنی سخاوت کے تحیّر میں تجھے ڈھونڈتا ہوں - چشمۂ خورشید سے خواہش میں بسر کرتا ہوں - دن چڑھتی سیہ لہروں میں گھُل مرتا ہے
شام آئی ، لہو بکھرا ، ہوا ٹھہری : نئی گوری زبان ڈھونڈتی بوسوں کی طلب گار مہ نو کی لکیر ابھری - بتا ، کونسی گلیوں میں ترا قبلۂ الحاق ہے - امروز میں فردا کی دلہن ہاتھوں پہ ہر لحظہ نئے پھول بناتی ہے - وہ کب آئے گا ، مَیں جانتا ہوں - رات کو دروازہ کھلا رکھے گی - اور وقتِ معیّن پہ بھلا آدمی کپڑوں کو اتارے گا
وہ کل آیا تھا : خاشاک بھری دولتِ ملبوس پہن ، پنبۂ ریشم سے چمٹ ، بھوک

ہے مغلوب سگ بادیہ گرداب زدہ، دائرہ در دائرہ تقدیر کے دانتوں کے
نشاں ۔۔۔۔ خوف و اذیت کا ثمر چکھتا ہوں ۔ میں نصفِ نہار، آفتِ شب،
مطلعِ رؤیا کی بکھر پہیلی
خوش پوش عداوت میں تڑپتا ہوں!
مرا چہرہ تضادات کی تاویل میں گھلتا ہے
مجھے مشکلیں دن ۔ دن کی گنہگار تہیں ۔ مٹی فنا ہوتی رخِ یار کی تابندہ کرن
پوچھتی ہے: کون ہو تم؟
تہمت ایّام اسیری کا سزاوار ہوں
تو میرے لئے رات کی تصویر میں دن ڈالنے سے لفظ بچا
میرے شعور آختہ ایام میں ابہام کی مے ڈال
مجھے خواہشِ تائید نہیں، خواہشِ مطلق ہوں ۔ جہاں چاہوں شبِ تار کو
پابند کروں، موجۂ عریانیٔ آغاز میں اعضا کو دھوؤں
دیکھ، ہوا محورِ اجداد پہ حاضر کی جبیں پونچھتی
دیوانگیٔ مہر و محبت کی ستائش پہ
در و بام کی بالفعل تجارت میں بکے جاتی ہے
میں کہتا ہوں: سب ٹھیک ہے!
میں آب تقدس میں نہاتا ہوا صدیوں کے کنارے پہ لگا
میں نے اگر رات سے کچھ پوچھنا چاہا بھی تو ۔۔۔۔
اُف توبہ، مجھے حیرت آغاز جاتے ہی گئی
لوگو! مرے پاؤں زمیں ڈھونڈتے ہیں ۔ میں نے بہت مدتیں

مآخذ

خواہش کی بجھارت میں گذاری ہیں، کہاں جاؤں
قدم ڈولتے ہیں، کوچۂ رؤیا میں فلک بخشیٔ تنہائی مگر جاگتی ہے
کار ملاقات جہاں سوز ہے
جنگل میں کھڑا راستے کے پھیر میں ہوں، آبلہ پا
لاکھ کہوں : میری زباندانی تناقص کا شکار، آدمی کا آدمی سے نعمتِ مترقبہ
کب بیچنے کا وقت پڑے، کوئی نہیں جانتا

ہر گھڑی دائرے بنتے ہیں

ہر گھڑی دائرے بنتے ہیں
گنجلک، سایۂ اشجار کی مانند اداس
مَیں ہوں محصور، زمیں گردشِ افلاک میں ہے
کوئی مقدر کا ستارہ بھی نہیں
کون زمیں ڈھونڈے
زمیں زیر قدم روز گذر کرتی ہے، تنہا و خزاں ماندہ
مرا دل کہ عفونت سے سزا یافتہ بوچڑ کی دکاں ہے، نہ جہاں اور جہت
منزلیں طے ہوں گی، کبھی روشنی، خندۂ گل روئے دلارام کو دھو ڈالے گی
وہ رات جسے میرا بدن اپنے لئے تیرا لحاف اور لہو سوچتا ہے
سوچتی رہ جائے گی
میں کھاٹ کی تاریک جدائی سے ابھر آؤں گا
سن، موت کی فریاد کو سن
اپنی تصویر مٹا،
دائرہ دیکھ،
قبریں تاریک ہیں، روشن ہیں بدن، رات میں سورج نے لحد پائی ہے

دریا

تنہا تنہا بہتی ندّی آخر کو دریا سے آن ملی ہے
پیڑ اور چشمے دور ہوئے ہیں، بھول گئے ہیں
یاد نہیں ہے وادی وادی پھرنے والا کاہکشاں کا دھارا کتنا شوریدہ سر تھا
دریا کا نام نہیں سن سکتا تھا: اپنی ذات میں یکتا تھا
پربت کی بیٹی، پانی کا دھارا
اک دوجے کا تن من ہوکر، ایک امٹ یکتائی میں گم
اپنے آپ کو پا لینے کی دُھن میں نکلے تھے، کچھ ہوش نہیں
.... ندّی، دریا سے آن ملی ہے
دریا، لامتناھی دریا سب پر حاوی ہے
وادی کو بے انت کُھلا میدان دریا ہے
سایوں کو روشن دن دریا ہے
نغموں کو خاموشی دریا ہے
مجھ کو میری مَیں دریا ہے
میری مَیں کو تُو دریا ہے
لیکن — میں، میں ہوں؛ تو، تو ہے
ہم میں حدّ فاصل وقت، زمیں اور سانس کا دریا ہے
یہ دریا، لاَمتناھی دریا، سب پر حاوی ہے
اور عدم سے قطرہ قطرہ پیدا ہونیوالے سبز سمندر کی آغوش میں سُچا موتی

مآخذ

میرے تیرے عکسِ شب زائیدہ سے
پربت کی بیٹی ، پانی کا دھارا ڈھونڈے گا
پل پل رنگ بدلتا جائے گا
کچھ نہیں پائے گا ، گبھرائے گا
لوگوں کے جنگل سے بھاگ کھڑا ہوگا
آخر ایک شجر کے سینے میں دریا پائے گا
اپنا دکھ بیگانہ کرکے
آنیوالوں کو دے جائے گا ، دریا میں مل جائے گا

جانیوالے....

جانیوالے تجھے رویا تو نہیں ہوں لیکن
میں نے یادوں کے پُراسرار حسیں مدفن میں
بڑی حسرت سے تجھے زیرِ تہ خاکِ ابد رکھا ہے
اور اس شہرِ خموشاں میں فقط تو ہی نہیں
میرے جذبات و خیالات بھی ہیں
زندگی راس نہ آئی جن کو
وہ ترے مونس و غمخوار بھی ہوتے ہیں
دیکھ یہ تیرے لئے تین سو پینسٹھ آنکھیں
جو مری روح کا اک حصہ ہیں
کس قدر درد سے روتی ہیں، تجھے دیکھتی ہیں
جانیوالے تجھے معلوم نہیں
میں نے یادوں کے پُراسرار حسیں مدفن میں
بڑی حسرت سے تجھے زیرِ تہِ خاکِ ابد رکھا ہے

تنہائی کا چہرہ

دھوپ نے سائے پھونک دئیے ہیں ، دیواریں تنہائی کا چہرہ ہیں
ایسا کوئی نہیں جو اپنی روح سلگتی دیکھے ، نازک پردوں سے باہر آئے
میری حرمت کی چاک گریبانی کی گرم بہاریں جانے
میں نے صدہا سالوں میں پوشیدہ تن کو میلا کرکے عریاں کر ڈالا ہے
شب کا نور نکھر آیا ہے، سورج جاگ پڑا ہے۔ سارے سائے خاک ہوئے ہیں۔
اور بدن آلائش سے آلود نہیں۔ دیواریں ہیں۔ دیواریں، جو تنہائی کا چہرہ ہیں۔
میں اس چہرے کو روز ازل سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میری کوئی راہ نہیں ہے،
ساری راہیں میری ہیں۔ میں سرگشتہ ہوں ! خوابوں کے محمل میں ہفت سماوات
اور زمیں لیکر چلتا ہوں، لیکن دیکھ نہیں سکتا ہوں—میرا تو گھر بار نہیں ہے۔
آنیوالے آئیں بھی تو خواب رہیں، تقدیر بنیں۔ تقدیر زدہ تاریکی میں گم، سائے!
میں چھونے آؤں تو دیواریں نکلیں—دیواریں ، جو تنہائی کا چہرہ ہیں! ایسے
میں گھر ملجائے ، محمل چھن جائے۔ حیف مقدر روز و شب نے گھیر لیا ہے ،
راہ نہیں ہے ! لیکن میں سرگشتہ ہوں۔ ڈھلتی شام روانہ ہو کر ، صبح
سویرے واپس آؤں
اپنا نام سناؤں - اور خوشی کا راز نہ پاؤں - اور خوشی سے مر مر
جاؤں

جب چاند اگا تھا

اگلے وقتوں میں جب چاند اگا تھا
ویرانے کی دھول نکھر کر پھول ہوئی تھی ، مجھ سے بھول ہوئی تھی
مٹی کے خاموش نگر کی جامد جھاگ اٹھا کر
شیریں نام لبوں پر رکھا ۔ آگ بجھا لی ، روح جلا لی
اور گنہ کی ظلمت قلب وجاں پر طاری کرکے ، رات بنا لی
ربِّ لیالی ! تیری ضو کی آنچ نرالی
تجھ بن ویرانے میں ازلاں والی تاریکی ، تنہائی
میں ؟ میرا کوئی انت نہیں ہے
اپنی وسعت میں گم ہو کر راہ بھلا لی ، آنچ گنوا لی
میرا قدم رنجہ کا طالب سایہ سوکھ گیا
میں کھوتے کھوتے حیرت خیز تعاقب میں نکلا
آج مجھے معلوم ہوا ہے
جس کی خاطر صحراؤں کی دھول ہوا تھا ، جھاگ نہیں ہے
پورا عقبیٰ: شعلے، آگ، جہنم ۔ میں لرزاں ، میں لرزاں ، مجھ پر سارا عالم تنگ ، زمینِ جھنگ سیالاں ماضی کے دامن سے نکلی، دھول ہوئی ۔ پر مجھ سے کیسی بھول ہوئی .... آج مجھے معلوم ہوا ہے بھول مری تقدیر ہوئی ہے

جُھک جاؤں گا

کرسی ، میز ، کتابیں اور اداسی ہے
مَیں ہوں اور اداسی ہے
سب کچھ گرد آلود پڑا ہے
گاہے گاہے سرد ہوا کا جھونکا گرد ہٹا کر چُھو لیتا ہے
برگد کی خاموشی رس بس جاتی ہے
رازبھری خوشبو احساس پہ چھا جاتی ہے
کرسی میز کتابیں گرد کے ازلی ساتھی ہیں
سرد ہوا کا جھونکا تو آشفتہ سر ہے
میری گرد اٹھا کر اپنا تن من میلا کرتا ہے
مٹی، اور سیاہی اور سمندر مَیں ہوں
مجھ میں خاک اور خون اور سانس کی لہریں اٹھتی ہیں
مجھ کو سرد نجانا ہات مسیحا کیسے ہوگا؟.... کیسے ہو گا؟——
سرد زمیں کا ذرہ ذرہ ھاتھ میں ھاتھ لئے سو جائے گا
کرسی میز کتابیں شب کے دامن میں کھو جائیں گی
خوشبو کے سوتے پھوٹیں گے ....
مجھ کو خاک ابھی ہونا ہے
گرد اور مجھ میں فرق نہیں ہے ، پھر ایسی تفریق بھلا کیوں
باھر سے آنیوالا جھونکا دیواروں سے ظاھر ہوگا
ساری چیزیں گرد آلود مقدر کا سکتہ پھینک اتاریں گی
میں زندہ ہو جاؤں گا ، نادم آنکھوں سے چھو کر جُھک جاؤں گا

نئے دن کی آماجگہ

میری حرفِ تمنا کی تحریر کے راز میں گمشدہ انگلیاں
لمس میں ترَ کسی ابتدا میں دمک جائیں گی
کوئی پوچھے سہی، اپنی آواز کی ناشناسا حدیں پھاند لوں گا
زباں پھر بھی مجبور ہے
خون کو خون سے آگہی کی عنابی روش ہے
زمیں پر فلک ایک پیوست مدھم نشاں ہے، نئی کہکشاں ہے
مگر دل کی بیچارگی بے اماں ہے
میں کس کس کی آواز پر جان دوں ؟
میرا تیرا علاقہ نہیں
میں ثواب و گنہ کو پیوں، دم کشی میں مروں
—— مجھ کو منظور ہے
میں نے ابتک تمنا ہی کی تھی
تمناؤں سے منسلک جبر کے سلسلوں سے ملاقات ہرگز نہیں تھی
ترے عارض و رخ کے پھولوں سے بارہ برس اپنے کالر سجائے
کبھی بیستوں کو نہ دیکھا
جوئے شیر تقدیر کے سلسلوں سے گذاروں تو آواز دینا، وگرنہ نہیں
میں نے حق مہر باندھا، نہ کامے پڑھائے، نجانے میں کیسے زن آشوئی
کرتا رہا، خیر میں جب تلک بیستوں کو نہ کاٹوں....

ذرا دیکھ تقدیر کی رات میں شادیانے بجے !
دھمک سے زمیں کانپتی ہے
ہوا تھرتھراتی لرزتی اماں ڈھونڈتی ہے
کھلی آنکھ سے کائنات اس جہیز اور سامان کو دیکھتے دیکھتے پھٹ رہی ہے
میں بارات کے مرکزی دائرے میں کھڑا ہوں
کھلی آنکھ مرجھا گئی ، رات ہی رات ہے

آج میرے ثواب و گنہ کے تعلق کی تجدید ہوگی : میں باقاعدہ تم سے شادی کروں گا ۔ تمہارے ازل خیز ہونٹوں کی تحریر کے راز میں گمشدہ انگلیاں اس میں ترکسی ابتدا میں دمک جائیں گی ۔ میں تمہارے برھنہ بدن کی بھری باس رگ رگ میں لے کر پھروں گا ۔ بگولوں کے لرزہ براندام تیشے سے سکتے کا دل چیر دوں گا ۔ نئے دن کی آماجگہ میں ولیمے کی دعوت کروں گا

گلی

دل کہ آباد نہیں
دل کہ برباد نہیں
دل کہ اب کچھ بھی نہیں، کچھ نہ کہے
دل اور آس پار کی بے پایاں نہیں کچھ نہ کہے
اور جب روز جہانتاب کے انجام کو اٹھتے ہوئے پاؤں پہ شفق کا نوحہ
گنبدِ ذہن میں گونجے
—تو مری روح میں پیوست فسانوں کی دلہن جاگ اٹھے
اور کہے: رنگ حنا نقشِ کفِ پا سے جدا ہے مگر آؤ، آؤ
—تو مری ذات کی تعمیر میں مخفی غمِ ازلی کا سیہ سانپ سا نغمہ جاگے
اور میں شعلوں کی آغوش میں، شعلے مجھ میں—اندر باہر—وصل کی آگ جلے
تو کہاں ہوتی ہے؟ معلوم نہیں
کس کو معلوم ہے؟ معلوم نہیں
مجھ کو معلوم ہے: یہ اومنی بس ہے، یہ تجارت کے مراکز ہیں، سیہ رات
میں بجلی کی ٹیوبوں کے کرشمے کیا ہیں
مجھ کو معلوم ہے: اس دور میں خوشحالی نے صنعت کی ترقی سے نمو پائی ہے
لیکن یہ سبھی کچھ کیا ہے
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں ہے لیکن میں ہوں—میں، کہ ہوں
رنگِ حنا نقشِ کفِ پا سے جدا

تو کہاں ہوتی ہے ؟ معلوم نہیں - کس کو معلوم ہے ؟ معلوم نہیں
دل اور اُس پار کی بے پایاں نہیں ، تجھ کو بھی معلوم نہیں ؟ کون گلی لوگ
گئے ؟ بیچ سمندر سے گذر لوگ گلی چھوڑ گئے - اور زمیں آب ہوئی ، اور
زمیں آب ہوئی ، اور زمیں آب ہوئی - میں گرفتار ہوں ، پابند ہوں ، پھر بھی
مَیں ہوں - میں چلا ، تو ہی سہی ، تو ہی سہی ، تو ہے ! . . . ہم اگر تیری
جگہ ہوتے تو کہتے : تو ہے . . . . تجھ کو معلوم نہیں میری سواری کے
قدم روحوں میں سبزے کو اگا سکتے ہیں - پھر کون گلی لوگ چلے جائیں ،
میں پانی سے پکاروں گا - مرے لفظ دل و جان سے نکھر آئیں گے ، پوچھے گی
ہوا : کون گلی رات ؟

ایک نباتات کا انداز ہے

دشت میں پابندیٔ افلاک حقیقت سے دھن سبز ہے
چوطرفہ نباتات کی یورش کا پیمانہ، شرارت سے بھرا رقص ہے
بُو باس! مسامات کے جھرنوں سے بدن بہتا ہے۔ اے غم کی سحر، مطلعٔ
مژگاں پہ چمک! صبحِ ملاقات کی مہلت سے گذر۔ دیکھ تو، انجام کی دنیا
کے تعاقب میں عجب مرحلۂ موت ہے۔ میں تیری شہادت ہوں۔ مجھے کوہ
ملاقات کی ویرانی سے ڈر آتا ہے۔ امروز کی مٹی پہ جبیں چھوڑ کے گرتا
ہوں: چمن اگتے ہیں۔ اشجار کے سائے میں ہری گھاس، مہک، سانپ۔
مرے جسم کی تاثیر میں عورت کا سیہ چاند ہے۔ کس شخص نے آواز
لگائی ہے؟ گلی گونج اٹھی! آج کی آواز میں تجدید کا احساس ہے، آ جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو رات گذر جائے۔ زمیں صبح سے بیتاب ہے.... اس
شخص کے ماتھے پہ زمانوں سے بھرا شہر، طلسمات۔ سیہ گنبدوں پر رنگ
شفق۔ کیڑوں مکوڑوں کا ہجوم۔ آدمی ہو؟ بھوت ہو؟ پھر کون ہو؟
آواز لگاتے ہو تو دہشت سے در و بام ڈھل جاتے ہیں۔ کیا رہنے نہیں دو
گے؟... مجھے بھولو نہیں۔ گیٹ پہ ہر روز گلے ملتے ہو۔ کہتے ہو کبھی
ساتھ بھی لے جائیں گے۔ میں روز تمہیں گیٹ سے گھر لاتا ہوں، لیجاتا ہوں۔
کیا یاد ہے تم لالۂ شب ڈھونڈتے بھٹکے تھے: گھنی شاخیں، نموداری کے
خدشات، سمندر، موجیں.... ماہ وش جاگ! مرے کوچۂ اجداد میں
پُر ہول صدا، لمحۂ وحدت میں چمک اٹھی، مَیں لذت کے منقش

ماخذ

درو دیوار میں صحرا کی درآمد سے پریشان ہوں
مقتول کی اماں نے کہا : میری سنو . . .
کوئی بھی معبود مگر اس کی توجہ کا ثناخوان نہ ہوا
رات کی بربادی میں ہر شخص کو خوب رونے کی فرصت ہی کہاں
روشنی کا نام بتا سکتا ہوں ، کیا پوچھوگی
تم کہدو : مرا خواہش و مایوسی کے مابین زمانہ ہے ۔ کئی سال ہوئے اُس کی محبت میں بسے حرف و حکایت سے گنہگار مقامات کی تصویریں در و بام پہ لٹکائی تھیں ۔ ہر گوشہ تصاویر کی تزئین سے زخمی تھا
مگر کہتا ہوں : تو کاہشِ بیداد سے شرمندگیٔ شوق میں تعزیرِ مقدر کی شہادت نہ ملا ۔ دیکھ ، شبِ تار سے بھرپور ہوا چلتی ہے ۔ اب بادۂ مستور توہّم کی ملاوٹ سے ترے کام نہیں آئے گا ۔ سب کھوٹا کھرا وقت کے میدان میں پرکھیں گے ۔ ابھی مرحلہ آیا ہی نہیں ۔ سارے مساوات کی تلوار ہیں ۔ اور جاگنے سونے میں کوئی فرق نہیں ۔ راتیں قدم ڈھونڈتی پھرتی ہیں ۔
مری جان ٹھہر ، آج نہ جا ، آج ہی مَیں موت ہوں
مقتول کی اماں نے کہا : میری سنو ، دل کی زمیں گھور اندھیرے میں نئے چاند سے شاداب ہوئی ۔ چاند ، مجھے دیکھتے ہو
دیکھتا ہوں ! دیکھ ، فلک اپنے کناروں میں لہو بھرنے لگا
میرے ترے عہد کی روداد کی چادر میں چمکتے ہوئے خورشید نے پھر غسل کیا ! روز یہی حشر ، یہی کن فیکون ۔ میرے قریب آؤ
مرے پاس شریفانہ حدیں ، خواہشیں ، ارمان نہیں
ایک نباتات کا انداز ہے !

چار سو ھُو حق

زمستان بیشہ و شہر تمنا کا تماشائی !
دریچے بند ہیں ، دَر سرنگوں ہیں ، خامشی ہے
نجانے کا ابد روئے گلِ صد برگ پر سایہ فگن ہے ' دل ہراساں ہے
مرے محفوظ دروازے پہ شاید رات کے ہاتھوں نے دستک دی کہ وحشت
چھا رہی ہے
ابھی پل میں کفِ دست فنا میرے لب و رخسار کی تابندگی سے جگمگائے گی
زمین و عرش الاعظم خونِ لالہ سے حنابندی کریں گے
جہاں میں ہوں ' وہاں کچھ بھی نہیں ہوگا ، فقط پژمردگی ہوگی
ہوا آئے گی
بحرِ نیلگوں کے سرد سینے پر شکستہ رنگ ذروں کو نہایت تک لئے پھرتی رہے گی
اور ظلمت کی بھری آغوش سے آخر ظہور آدم خاکی مجھے تنہائی بخشے گا
میں حیران کوچۂ جاناں کی رعنائی کو دیکھوں گا ۔ بدن بے حرکتی میں منجمد
اندھے تصور کی دلاویزی کی حد سے ماورا ' وصلِ دو عالم میں بسا
احساس کی شرمندگی کی دھوپ میں ، محبوب کے
شیریں ' عدم رفتہ ' نجانے تن کو چھو کر کھول جائے گا ۔ جیسے زندان
ہستی میں تلاش و جستجو کے بعد بھی وہم و گماں پایا ' بالاخر خیمۂ شب
میں اُسی کی ذات سے شیر و شکر ہونے کی لذت حشر تک مصروف رکھے گی ۔
زمانہ دم بخود دیکھا کرے گا ' دن نہیں ہو گا ۔ دریچے روشنی ممنوع رکھیں

کے - سکوت دشت کا هیہات صہبائے شبینہ کے رگ و پے میں اتر جائے گا -
دروازے پہ دستک ہو گی - پھر بعد سر مُو پھیلتا ، بڑھتا ، امڈتا شوق کے
اندھے زمین و آسماں کا درمیان ہو جائے گا - دیوار کے سینے میں جاگی ، جاگتی
حرکت اُجڑ جائے گی - خاموشی کی سطحِ آبگوں پر تیرتی روشن نگاہیں ،
روشنی ، ظلمات کی آغوش میں کھو جائے گی - اندھی سیاہی - چار سُو ھُوحق -
سمے اندر سماں - شامِ غریباں - قافلہ صد سال کی صحرانوردی ، جستجو کو
وادیٔ صد صد بہاراں ، یا بیابانِ بہار آلود جائے
یا نہ جائے ، چپ رہے - ساکت
زمیں پر آسماں کی سرد چادر ہے - گلوں کے حاشیے سکڑے ہوئے ہیں - اور
نگاہ شوخِ گلچیں میری آنکھوں کی چمک کو لفظ کی تعبیر دے - دیدے !
میں نورستہ نہیں ، صد سال کی صحرا نوردی کا ثمر ہوں - موسموں کی
سختیوں ، تقدیر کی بے مہریوں کے بعد بھی ڈنٹھل ہری ، مٹی کھری . . .
پوشاک میں سبزے کی لو ہوگی - ہمارے کھیت بنجر ہیں : کہیں پوھلی ،
کہیں کانٹے ہیں - سردی سخت ہے ، شل ہاتھ ہیں ، ہل جوڑنے سے جان
جاتی ہے - مگر گندم نہیں بوئیں گے تو کھائیں گے کیا ؟ ہاں ، کل سویرے
آسماں کے زیرِ سایہ بیج بوئیں گے - کٹائی اور گہائی تک دعا گوئی آنچل
سر پہ رکھیں گے - فلک کی بھی نظر ہوتی ہے - امّاں آخری قصہ سنائے
گی تو پھر ہم جشن کی تمہید رکھیں گے - عزیزوں ، دوستوں ، اپنوں ،
پرائیوں کو نئی گندم کی دعوت پر بلائیں گے - خوشی کے گیت گائیں گے

ویرانی

جب میں تم سے ملتا ہوں ' اپنی روح فنا پاتا ہوں
ــــــ اپنا آپ نہیں ہے ' ویرانی ہے
میرے لفظ معانی کھوکر
حیرت کی تسخیر نہ ہونیوالی
آوازوں کی وادی میں کھل اٹھتے ہیں
کومل پھول' پیاری کلیاں ! میرے لفظ ' تمہاری آنکھیں !
لا محدود لق و دق صحرا میں
شادابی ' خوشبو - خوشبو' جس سے پہلی بار تمہارے جادو کا احساس ہوا تھا
ڈھونڈ لیا تھا ' جان لیا تھا
ہاتھ سے ہاتھ چھوا تھا۔ سنگھم میں سویا سورج' مشرق کا متلاشی سورج
مجھکو شاید تمکو بھی پگھلاتا تھا ' اور ازل نہیں پاتا تھا
خاموشی میں رات ' انوکھی رات ' اچانک اپنی دنیا میں درآئی
سکتہ جاگا
جاگ پڑی رعنائی
سبزے پر بے انت گھنی خاموشی
کالک کی دیوار ' عقب میں سُونا جنگل ' سب کچھ عریاں
خورشید ازل تک جا پہنچا تھا
میں تحفے لیکر پاس گیا

ماخذ

دھوپ کڑی تھی ، مشرق پھوٹ بہا تھا ، سکتہ ڈوب گیا تھا
میں تھا ، تم تھے —— کچھ بھی نہیں تھا
ہستی کی شیرازہ بندی ٹوٹ گئی تھی
سانس ، آواز ، نگہ سے بہتی ، غیر مقید آگ گواہی دیتی ، ذرے ذرے کو
کونپیں دکھاتی ، سبز خوشی میں ناچ رہی تھی
میری تیری بات نہیں تھی
ارض و سما میں ایک قیامت بر پا تھی
کیسا جان کنی کا لمحہ تھا
سب کچھ موت ہوا تھا
لا محدود لق و دق صحرا ! اپنا آپ نہیں تھا ، ویرانی تھی

کچھ بھی نہیں بدلے گا

تیسری صبح زمیں کا سینہ پھٹ گیا۔ اُس نے سمندر دیکھا۔ روشنی چاروں طرف پھیل گئی

گدھ کے پروں کے سائے آسماں چیر کے، روحوں کے صدف پھوڑ کے پتھر کا لہو پینے لگے

مجھ میں رمق ہے، ٹھہرو! میری آواز سے بیزار ہوئے ہو؟ ٹھہرو!

میں صدف چھوڑ کے جاؤں گا تو بدلہ لینا

جیتے جی آنکھ سے رنگوں کے شرر چھینتے ہو، صبر کرو! ٹھہرو!

آسماں سرد ہے، میرے جملے بے طرح روندے گئے ہیں

مجھے پتھر سے نکل لینے دو! ٹھہرو — دیکھو! پھر جسے خوب سمجھتے ہو وہی کچھ کرنا۔ میں کسی شوق کا عنوان نہیں

کون نہیں؟ —

مَیں! —

میرے سینے میں ملاقات کی تجدید کا ارمان نہیں

میرے وعدوں میں پریشانی، تعبیر کے دھندلے سائے، پھیلتے بڑھتے امڈتے سائے

میری آمد سے پشیماں ہیں۔ میں حیراں ہوں۔ کس لئے، کس کیلئے خاک سے الفت کا لبادہ اوڑھوں

میں ہمیشہ ہی انہیں رات کی آواز کی مانند ملا ہوں، لیکن —

کاش میں رات کی تعبیر میں کھوتا۔ میں نے روشنی بانٹ کے، جو کچھ بھی ہوا

کچھ بھی نہیں بدلے گا

منقش پیالوں میں کہنہ تمنا

مری ذات کے نرم خوشوں میں تہذیب کی سنسناہٹ !
پہاڑ اور ٹیلے ، ابھرتے ہوئے — نرم روئی میں ننھی وریدیں
کئی سلوٹیں : مخملیں ، نرم و نازک ، سرکتی ہوئی
تعاقب میں لہروں کے لہریں
پھسلتے برانگیختہ دست وبازو ، رگ وپے میں ہلکا تشنج
تھرکتی ہوئی بوکاپٹس کی سطحیں ! وہ قدموں کے پیہم نشانات
غنچے ، تمنا ، خوشی ، لمس کا خوف ۔ بارش ، برستی ہوائیں
ہوا کے تھپیڑے علامات کو مسخ کرتے ہوئے ـــــــ
گیلے حرفوں پہ نومشق بچے کا دامن گھسٹ جائے ۔ اندھے حوادث
نئے زائچے ہیں مگر جو بھی ہیروگلائفکس میں ہے ـــــ
کمر ، سینے اور پنڈلیوں کو یوں گدگداتی نہیں
کونسے سر میں سودا نہیں ، کہنہ
منقش پیالوں میں کہنہ تمنا ۔ تھکاوٹ سے بیزار ہوں
تیرے یاقوت جھلمل جھلکتے ، سیاہی کے جنگل ! یہ کس آنکھ میں دھند ہے
تو ندامت کا پردہ اٹھا
سرد لفظوں کی اس رات میں ایک موتی زمیں پر گرا ہے
مگر موجِ دریائے درد اس خوشی کے کنارے نہیں پھاند سکتی
ہم پہاڑوں کی دوری میں مستور ہیں ، چار سو پھیلے میدان ہیں

نئی بشارت کا مرحلہ ہے

نئی بشارت کا مرحلہ ہے ! خبر کرو روشنی کا دریا امڈ پڑا ہے
زمیں کی شاداب دھڑکنوں سے کبھی تو اعلائے کلمۃ الحق ہوا : تقدس بھرا
ترانہ نچڑ رہا ہے
مرے مقدر کا مرثیہ گو مرا بدن ہے کہ آرزو کی سبھی طنابیں
کشاکشِ روز وشب کے تاؤ میں کھڈی ہو ہو کے میری امی کی چارپائی
کی پائنتی میں ــــ
پیاری امی ! یہ چارپائی بہت ہی ڈھیلی ہے - مخملیں تخت پوش کیسے
چمک رہا ہے
سمندروں کا مہیب مدوجذر کہاں کھو گیا ہے ؟ دیکھوں ؟ نہیں نہیں !
آسماں پہ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ بہت ہی نیچے ہیں
بارش آئی !!
یہ کون ہے ؟
کس نے سہرا باندھا ہے ؟
اور اس آئینے میں کس کے بدن کی رونق بھری ہوئی ہے
سمندروں سے ابھرنے والی ہوائیں پھر سے بپھر گئی ہیں
پیاری امی ! لحاف میں بیٹھ جاؤں ؟ سردی سے جم رہا ہوں ! خمیرے آٹے کی
کھٹی کھٹی بساند ــــ تو کیا ہوا
کھنڈر ہیں ! گھُٹی ہوئی کال کوٹھڑی کی ہوا میں مکڑی کا نرم جالا تڑپ

رہا ہے - یہاں پہ کوئی نہیں ہے
کیوں ؟ . . . اس کمیں گہ تیرگی میں صدیوں سے روشنی کا گذر نہیں ہے
عجیب دہشت کی تھرتھری ہے
مجھے یہاں سورجوں کے آٹے میں تیرگی کا نمک — ! چکھاؤ امی ' یہ پوڑے کیسے ہیں ؟
چکنی مٹی ! ہمارے آنگن میں پانی آیا ہے - چاروں پائے زمیں کے سینے میں دھنس گئے ہیں
ستوں زمیں سے فلک تلک ہیں - سمندروں کے مہیب مدّ و جذر میں شورِ نشور گھل مل گیا ہے
پائنتی پہ گرم پانی کے چھینٹے پڑتے ہیں
دھوپ چھاؤں نے انقلابِ عظیم برپا کیا ہوا ہے
سفید تاروں میں کالے تاروں سے تھرتھری ہے
نجانے بُنتی کی نہج کیا ہو ؟ نمولہ 'سحر البیانی' صبح کا عقب ہے

ھوا پریشان کر رھی ھے

ھوا پریشان کر رھی ھے
تری قسم دن عجیب ماضی کا مرثیہ ھے
مری گواھی خموش پیڑوں کے نقش میں ھے
میں چکنی مٹی کا لوتھڑا ھوں
نصیب کے لفظ کیلئے پورے نہیں ھیں
ھمارے گھر میں خوشی نہیں ھے
ھوئی تو دروازے کھول دیں گے - تمھارا گھر ھے - پرائے ھر گز نہیں ھو
آنا ، ضرور آنا
ھماری مجبوریوں کو دیکھو - یہ بے رخی تو نہیں - ھماری تمام تر معذرت کے
با وصف دل شکستہ کھڑے ھو - دیکھو ـــــ
خوشی غمی روز لب تفاوت سے چومتی ھے -
ھمارا سایہ بہار سے بھاگ جائے گا : کوڑیوں کے پیچھے ، فنا نہیں
اسکی آرزو ھے وہ کھیل کھیلے : بتاؤ سیدھی ھیں یا . . . . ھمارے نصیب
گردش کے زیر سایہ ھیں !
لٹو کُٹ ھو چُکا ھے - لیکن ھوا پریشان کر رھی ھے - خموش ھے - چل رھا
ھے شاید - نہیں ، کھڑا ھے
تمھارا لٹو کہ جس کی رسی دراز تھی ، ڈگمگا رھا ھے - چھٹا ہو کھیلو گے ؟
آؤ کھیلو !

نہیں نہیں کیا ؟

ضرور کھیلو - ہمارے خانوں کا راستہ روند مار کے تم نے روک رکھا ہے
راستہ دو ! ہمارا لٹو گرا نہیں ہے

میں جتنے خانوں کو کھول سکتا ہوں ، کھول دوں گا - زمین پہ اہرام کی
تشدد زدہ بہاروں کی تیرگی ہے

تمہارا لٹو فساد پر اوندھے منہ پڑا ہے - روؤ نہیں - مینہ برسنے والا ہے

کوئی لٹو نہیں چلے گا - ہوائیں محبوب سے تمنا کا لمس پاتی ہیں ، اور پردوں کی
سرسراہٹ میں لفظ بھرتی ہیں - ڈوبتے ، قطرہ قطرہ مٹتے جہاں کی وحدت کے
ممکنے ڈوبتی نگاہوں میں تیرتے ہیں - یہ ترمرے ! اپنی بازگشت ، اسکی
داستاں - میں نے اگلے پچھلے تمام قضیے چکا دئے ہیں- تمہار الٹو کہاں چلے گا

زمانہ گھور رہا ہے

دھرتی کے سینے میں دفن غضب کی دھڑکن
تن من کے مدفن سے جاگ پڑی ہے
عورت تھر تھر کانپ رہی ہے
خوابوں کی تعبیر ابھر رہی ہے
قدرت کا دربار لگا ہوا ہے
گل بوٹے اشجار کپھائیں، لوہے کے بیجوں سے جنکو میرے ھاتھ اگائیں،
جھوم رہے ھیں
دل حیرت سے بیکل ہے - چشم زدن میں در آنیوالی لمحوں کی بیتاب منازل
بیت رہی ھیں - کوئی نقش نہیں بنتا ہے - پہلا نقش کہ جسکا نقش نہیں،
محض تمناؤں کا مایہ ہے، کتنی ہیبت سے ٹھہرا ہے... پل بھر کا ٹھہراؤ—
تھر تھر کرتا
پھر ہر چیز خموشی سے بھر جائیگی، جیتی جاگتی آنکھوں کا دربار اجڑ جائے گا
آنیوالے اپنا آپ زمین کو دیں گے
سبزہ جھلمل کرتے موتیوں سے بھر جائے گا، نقش ابھر آئے گا!
کون مری آنکھوں میں جھمکی مایوسی کو اپنے ھونٹوں پر پھیلا کر
ارض و سما پر ایک پوتر خواب چڑھا دے گا
ہر شے دھندلی، نازک اور سیہ خاموشی سے بھر دے گا.... کوئی نہیں ہے
وہ جانا پہچانا ٹھہرا لمحہ راتوں رات گذر گیا ہے
میں تنہا ہوں - کل وہ میرے ساتھ پھرا تھا

ماخذ

اُسکی بائیں آنکھ چمکتی میرے اندر جھانک رہی تھی
میں نے دیکھا : قطرہ قطرہ سرد فلک بہہ جائے گا
جینے والا مر جائے گا ، سرد ہوا رہ جائے گی
پانی کا تابوت سبھی کچھ اپنے من میں رکھ کر کوکھ ہری کر لے گا
میری یادوں کا بیخواب سفینہ چاروں کھونٹ پھرے گا ، اپنا آپ مٹائے گا
—— جب اس نے اپنا خواب ادھورا چھوڑا
شب کا لمبا لمحہ

خاموشی کی دیوار
دریچوں پر صندل کے پردے
دروازے پر زنجیر
—— مرا دل خوف سے کانپا
ہاتھ پکڑ کر اپنا نام پکارا ، آنکھیں کھولیں
دھرت آکاش کا لمس پگھل کر دھندلائی آواز ہوا جاتا تھا
گویائی میں خاک سمائی : سر سر کرتی موج - حیات - خوشی کی کرنیں
ٹھہرو ! اپنا باج سنبھالو ، رستہ دیدو . . .
کوئی چیز چٹانوں کے وقفے سے پار نہیں پہنچی ہے
لو ! سفاک چٹانیں سر ٹکرانے والی ہیں
پانی کی آغوش تموّج میں ہے
زندگی دینے والے ان قربان گھوں پر اپنا جسم نہیں پائیں گے
مونگے کے معدوم جزیروں میں اپنا آپ تلاش کریں گے

جلووں سے محروم رہیں گے
اور در و دیوار ، زمیں کی ریکھا۰۰۰۰رقص کا دف دھلائے گا
میں کس کو ڈھونڈوں گا ؟
گلیوں بازاروں کی اجنبی شکلیں کیسے یاد رہیں گی ؟
رستہ بھول نہ جاؤں گا ؟
دیکھو ، طبلچی لوہے کی ہیبت سے سنگت کرتا قید ہوا ہے
چاروں جانب گونج رہا ہے ، چاروں جانبیں گونج رہی ہیں
خواہش کا دروازہ بند پڑا ہے
باہر کیسے جاؤں ؟
جانیوالے چلے گئے ہیں
کافر کوکھ بھری ہے ، گاڑی گذر گئی ہے
میں بیکار کھڑا ہوں
مجھ کو زمانہ گھور رہا ہے
——میں مفرور سزا سے ڈرتا قیدی ہوں
تنہائی کے سکتے سے کیا پوچھ رہا ہوں
——آنیوالے دن سے جو کچھ پھوٹے
کون مجھے بتلائے گا ؟

بالکل سوچ نہیں سکتا ہوں

ذہن کسی کا پاکیزہ استھان نہیں ہے، سب اوصاف محاسن خاک ہوئے ہیں
لیکن اس کے گرم کنوارے تن کی خوشبو
روح و رواں کی اطلس اور کتاں سے چھن چھن پھوٹ بہے
سرشار کرے، تو کون کہے گا دن موجود نہیں
لاریب تمنا کی تمہید کا دن گرماتا ہے
پھر بھی لفظوں میں الجھاؤ پہلے دن کی ظلمت سے پیوست ہوا ہے
جس کا نام نہیں ہے، اس کا راز کلام کہاں کھووے گا
مَیں نادم ہوں۔ سب دروازے بند پڑے ہیں۔ رات ہوئی ہے۔ بستر پر کیسے جاؤں
سرد نہیں ہوں
شعلے پھر سے چونک پڑے ہیں
ذہن جلا جاتا ہے
اپنے تن سے شرم آتی ہے
صبح و شام جنم اشنان لئے جب لُس لُس کرتا گلگوں گوشت چھپائے
من کی آنچ دئے کی لو سے بھر دیں
تو دن کی دھڑکن، صبحِ ازل سے شامِ ابد تک پھیلے اتنے پرانے دن کی دھڑکن
انجانی آواز ہا سے سنگت کر کے
ہستی کو ناپید نہ ہونیوالی وسعت دے دے
آنکھیں چلمن سے جھانکیں، دیدار طلب چہرے سے ملنے سے گھبرائیں

پوچھوں : کون ہو تم ؟ میں آسکتا ہوں ؟ میری رگ رگ تھرک رہی ہے
تم سے کیسی جسم بھری خوشبو آتی ہے !
میں بے نام ہوں ، ٹوٹ چکا ہوں
—— جو کچھ ہوں سو ہوں ۔ کیسے شب خوابی کا نااہل ہوا ہوں
دروازے پر دستک دینے کا ارمان کبھی نہیں پورا ہوگا
کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے ، ہیچ ہوا ہوں
دن کا تن چھونے سے شرم آتی ہے
سوچ نہیں سکتا ہوں ، بالکل سوچ نہیں سکتا ہوں

قصّہ پاک ہوا ہے

میں نے پوچھا : گھر جاؤ گے ؟ اچھا پھر کب لوٹو گے ؟ ہاں تو کوئی بات سناؤ ,
لیکن وہ خاموش رہا ۔ میرے لفظ پلٹ آئے : کب واپسی ہوگی ؟
اب کوئی لوٹ نہیں سکتا ہے
رستہ ماتھے پر ہے
صحراؤں نے دل دریا سمندر چوس لئے ہیں ، آؤ فاتحہ خوانی کر لیں
باقی جو کچھ ہوگا ، دیکھا جائیگا۔۰۰۰۰لیکن وہ تو بیت چکا تھا
اجڑی رنگت بدل گئی تھی
وادی وادی پھیلاؤ تھا
پھول سہانے رستہ دیکھ رہے تھے
الجھی تمناؤں کا نغمہ گونج رہا تھا —— خاموشی تھی
گذرا لمحہ خاموشی ہے
ماضی کے چہرے سے نقش تلاش کیا ہے ، قصہ پاک ہوا ہے
اتنی جھجک تھی
آج تعارف ہو ہی گیا۔۰۰۰۰اسکی اجڑی رنگت میں پھول سلگ رہے تھے
میں نے اپنی زباں سے اسکے لفظ کہے۔ کتنے بامعنی تھے! پھر بھی بے معنی تھے
میں نے لفظ نگل لئے
اور سرھانے سے اٹھتی پھولوں کی خوشبو سے روح شرابور ہوئی
میں اوہام پرست نہیں ہوں

ھفت سماوات اور زمیں گردش میں قید ھوئے
سارے تعلق ٹوٹ گئے
مجھ سے کیا کچھ پوچھ رہے ھو ؟ میں ھر راز بیاں کرنے سے عاجز ھوں
میرے پاس کسی کا نام نہیں ھے
میرے کان حقیقت کی آواز نہیں سنتے ھیں
شک ، سرگوشیوں کے نقارے ھیں
استفسار ھی استفسار ، جواب نہیں ھیں
مَیں کیا چپ ھی رھوں - شاید - تو ؟ تو کیا ؟ بس ایسے ھی ھے - میں نے پہلی مرتبہ بچے کے رونے کی آواز سنی ھے - پہلی بار پہاڑی پر چلاّنے والی ، روحوں کے سنّاٹے میں تھرّانے والی گونج زمیں پر شبنم شبنم ، لمحہ لمحہ - روز ابدتک - اسکی تابندہ پاکیزہ جبیں پر آنیوالا کل قربان - کل اور آج اور کل میں اسکی لالی.... جاؤ ، دیکھو - جاؤ گے ؟ خاموش نگاھوں سے کیا پوچھ رہے ھو ؟ بولو

دیوانگی ، شعلے ، پھیلاؤ

مجھے اپنی آنکھوں کے روشن مقاموں سے آواز دے
راستے کا دریچہ زمیں آسماں کی تفاوت میں ہے
کس کی دہلیز کے پار سرخاب ہیں
آؤ ، پگڑی بدل لو : سیاہی کی آغوش میں پھول ہیں
پھر نہ کہنا خبر کے خریدار تھے
مری رات دن سے لڑائی نہیں : دودھیا آسماں پر سیاہی کے دھبے !
اگر کوئی بھرپور خواہش کا میدان مارے ، تو جانے
پرانی حقیقت کی تائید میں ،
جاؤ ، میدان میں جاؤ
تغیّر تبدّل کی موجیں لپکتی ہیں
فقروں میں تعبیر کی معذرت ہو تو ہو ، اور کچھ بھی نہیں
مجھ کو تاریک دیوار ٹھنڈی عقوبت کے سائے میں تحلیل کرتی ہے
میں چیختا ہوں
بتاؤ ، بتاؤ ، مرے خواب کس کھیت میں دفن ہیں
میں نہیں جانتا ۔ موت کھیتوں میں آگتی نہیں ہے
یہ ممکن ہے ۔ ۔ ۔ پھر بھی سنگھاسن پہ عریاں تنومند بیٹے کا غسلِ منزّہ :
نگہ چونک اٹھی ۔ تمنا کی بارش میں تائیدِ غیبی کا پرتو ۔ مجھے روزِ روشن
کے چہرے کے نقش و نگار آفرینش کا موسم سُجھاتے رہے ۔ زرد پھولوں پہ شبنم

کی تھرتھر تھرکتی فلک زا چمک - رونق خون چکاں ، لختِ جاں کی
فروعات میں ششدر و دمبخود - ٹھہری آنکھوں میں نیلا سمندر - پرچھرہ
خواہش کا ہیجان تن غرق - آموختہ معرفت کا دریچہ کھلا - سایہ میدان
میں کودا - میں دیوانہ وار اپنی وحشت میں لوٹا - ہوا بند تھی - زرد
پھولوں کی حالت دگرگوں ! عداوت پلٹ آئی - چپ چاپ ، دہشت سے پھٹتے
ہوئے میں نے آنکھیں جھپک لیں
میری عورت سویرے بتانے لگی : چودھویں چاند سے رات بھر ہم ملاقات
کرتے رہے ، اس نے ہر ایک عورت کو ملبوس بخشا ہے - بیجوں کی آنکھیں
نکل آئیں گی - قحط کے روز ہم اپنی اولاد کا دان دیں گے
شبیہوں کا پگھلاؤ : پُر ہول ، سحر آفریں - آدمی کی وراثت ، نیا آئینہ - اسکی
آنکھیں اکیلے میں پتھرا گئیں - نیلے صحرا میں شاداب سورج ستارے کنول !
میری ہستی کے تاریک خوابوں میں دیوانگی ، شعلے ، پھیلاؤ

سیاھی سے چیزیں بناتا ھوں

سیاھی سے چیزیں بناتا ھوں لیکن
مجھے اپنی تخلیق سے اپنے بیٹے کی آواز آتی نہیں
اُس کے سہ رنگ پھول ایک گلدان میں ھیں
زمیں پر ھمیشہ ھمیشہ کے نوحوں کی قوسِ قزح جھانکتی ھے
مجھے آگ میں ڈال کندن کیا : میں فنا ھوں ، بقا ھوں
مجھے زندگی ، موت سے اپنی آواز آتی نہیں
میں نے اُسکی پوتّر ، سڑی ھڈیوں سے جہنم کی ترتیب دی
ساری خوشیاں جلیں ـــــ میری اولاد
ٹہنی پہ سہ رنگ پھول - ایک گلدان - بیٹھک کے کونے میں رکّھا ھوا
لالہ و گل کی جلوہ گری میری آنکھوں میں مجبور ھے - میں خریدار ھوں
میری آنکھوں میں دیکھو
سلگتے زمانوں کا اندوہ کیسے نکھر آیا ھے
میرے ھاتھوں سے نیلے سمندر کی صورتگری کا عجوبہ ھوا ھے
بلا خوف آؤ ، جہاں موت کندن نہیں ڈھونڈتی
اِن محلات کے بیخ و بُن میں زمانہ نہیں ھے ، مری ذات ھے
میں نے جیون بلیدان میں دے دیا ھے
کتابوں کی الماریاں نیم کی چھال سے ـــــ خیر ،
قالین کے شامیانے میں قندیل کا سرد شعلہ بھبک جائے تو خوب ھے

تجزیہ اور تجرید میرے لئے زادِ رہ ہے
میں تشکیک و تقدیر کی سرزمیں کا عجب رکھ رکھاؤ سے جغرافیہ لکھ رہا ہوں
لکیریں ہیں، کانٹے ہیں، صحرا و صرصر
تکلّف کے سبزے کی چادر کہاں پر بچھاؤں، گنہگار ہوں
میرے ہونٹوں پہ دن کی جان کھردری پپڑی بن گئی ہے
زباں خشک ہے، سانس کی آنچ نتھنوں کو دہکا رہی ہے
مگر سارا پانی مقدس بدن کی امانت ہوا ہے
کنول، سبز ڈنٹھل پہ سویا ہوا ہے
جہنم ہواؤں کے دامن سے لپٹی گلی کوچوں، صحنوں، دریچوں سے بہتی ہے
لیکن مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی ہے، بہت سخت گرمی ہے!

We are walking into time
and our bodies shine
with steps ineffable
that are stamped in the fables.....

—*Paul Valery*

خواب مرا پرتو ھیں

خواب مرا پرتو ھیں لیکن خواب مرا ادراک نہیں ھیں
میں انسانی جدوجہد کا شور حقیقت بے ترتیب نہیں، ایک منظم سلسلۂ موقوف ھوں!
موجیں جانے پہچانے ساحلِ ھست و حقیقت کو یلغار تلے لے آئی ھیں۔ مچھلیاں ریگِ رواں کے نقش و نگار بنیں، کیا خوب بنی آدم کے مقرر کردہ رسم و رواجِ شناسائی پر جھلک رھی ھیں۔ کون سی شے متحجّر ھوگی، کون دوبارہ ملکِ عدم پر پردۂ موجودات چڑھائے گا۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ میرا مقصد پھیلاؤ سے حرف خفی کو جلی کرنا ھے۔ کوکھ میں بیج بکھیرنا، اپنا فرض ادا کرنے ھی جل مرنا ھے۔ باقی شمع، پری، پروانہ جانے۔ میرا گھور اندھیرا۔ پگھلے، تڑپ تڑپ کر تختۂ مشقِ ستم پر وقفِ راز و نیاز رھے۔ اندام نہانیٔ نقش و نگارِ نمو کی بعثت کو رونقِ گل کے طولِ و عرض پر حاوی کر کے، جامِ شہادت اصلِ اصول عنایت کر دے، اور مغموم، سدا مغموم رھے۔ تشدیدِ رقابت چھینَ، دوئی کا بیج مٹاوے۔ مادر زاد پسر کا پھول برھنہ دن میں گالیاں کھاوے، سجدیوں بارہ نہ آوے۔ ماتھے اوپر ماتھا، آنکھوں میں آنکھیں، کہنیاں پسلیوں سے ٹکرائیں۔ اوٹ کا کھوٹ گواچے،
بن میں سمندر ناچے
دیکھو، شفق کے ڈوبتے سار سنہری چڑیاں گھونسلے چھوڑیں
سوتے جاگتے پھولوں کے چہروں سے شبنم کو چنیں
مدّت بعد کمیٹیاں چاند نگاھوں میں رکھیں گی۔ تلخ! زمیں جنبد، اور

تلخ! نہ جنبد ۔ راستے سڑکیں چاندنی کی بارش میں نہائیں ۔ آتی جاتی لڑکیاں تن من کو سمٹائیں ، چاندنی سے شرمائیں۔ کتنی عجب ہے! کپڑے چھوڑ غسلخانے میں ننگ دھڑنگ چلی آئی ہے! دہلیزوں پر قبضے چیخ رہے ہیں ۔ موجوں کے پٹ اندر باہر جھانک رہے ہیں ۔ اور فحاشی حدِّ نگہ سے آگے پیچھے ہٹتے افق کو پھاند گئی ہے ۔ توبہ استغفار! نگاہیں باطن ، باطل آنکھیں ، قبضۂ قدرت قتل و خون ۔ وہ لاج سے مر مر جائیں ۔ پھٹی ، طینت سے مجبور ۔ چمکتے موتیوں کی فرمائش ہے ؟ میں لا دوں گا ۔ انعامی نمائش منٹو پارک میں جاری ہے ۔ چیزیں خریدیں تو انعام کا حق بھی ملتا ہے ۔ میں حق بھی لیتا آؤں گا ۔ لیکن پورا کرانا میرا کام نہیں ہے ۔ میرا کام تو پھیلاؤ میں جسم و جاں کو بگھونا ہے ۔ کیا جانتی ہو ، میں جسم و جاں کو بھگو لوں گا تو کیا ہوگا ؟ تم سچ مچ پوچھنا چاہتی ہو! اب جانے دو ۔ پھر بتلاؤں گا ۔ فی الحال یہی کافی ہے ــــــ!

جاؤ اپنے باپ کا گھر آباد کرو

پوری کی پوری آبادی جو دفن ہوئی تو . . . . کہتے ہیں نبی کے پند و ہدایت کے روغن سے لوگوں کا چراغِ عصیاں شعلۂ نوعنواں نہیں بنتا تھا ۔ جیسے بھی ہوتا ، خوشبو کا جھرنا ان کی کُل میں ضم ہو جاتا ۔ میں نے کہا : تم گاؤں چھوڑو ۔ آنکھیں بند کرو ۔ جو دیکھ نہیں سکتے ہو ، اس سے گذر کرو ۔ دل معبد مشتِ غبار معطّر ہو نہ سکے گا ۔ میری جانی پہچانی محبوب ہوائیں کس کے لئے اب امس کی تیرہ و تار دقوبت سہتی ہیں ، تم جاؤ . . . . . سمندر کے ناپاک ارادے اس کو ڈھونڈ رہے تھے ۔

نادانی کی مشکوک زمینیں آگنے کی شاداب تمناؤں میں پکتی تھیں۔ وہ لڑکیاں
کہنے لگیں : دنیا کے دستور مطابق کوئی مرد ہمارے پاس نہیں آئے گا . . . .
موٹریں کاریں گلشنِ چشمِ تماشہ کھول رہی ہیں ۔ مست خرامی : سپنوں
میں لپٹی ، لہریں ابھرتی غائب ہوتی - نرم ہوا کے جھونکے ۔ کالے سفید
سلولائیڈ کے شوخ چمکتے نقش ، ذرا سی دیر میں دھند اور کہرے میں
جھلمل کرتے نقش کے ٹکڑے ، کرچیاں ۔ کوندے ، تیرگی - تیرگی کوندے !
ساری ترائی آگ ہوئی ۔ آگ سے باری باری گذرنے والی لڑکیاں بھول گئیں :
کب لیٹی تھیں ، کب جاگی تھیں ۔ بیچ میں یاد آتا ، تھرّاتا ، بھولتا صدمہ ۔
بڑھتا ، پھلتا پھولتا ، پھیلتا کفر الحاد ۔ سمندر بھیگ رہے تھے ۔ موٹریں
کاریں آتی جاتی جوت جگاویں ۔ روشنی کا فوّارہ چھوٹے ، ڈوبے ، سطح
پہ آوے ، دمکے دھندلا جاوے ۔ بارہ مرتبہ سر پھوڑوایا
تب دھرتی پرامن و اماں کے نخلِ تمنا کے شاداب صحیفوں کی تدوین ہوئی
—— تو میں نے جانا

سوئے سمندر کارگہ تولید شفاعت کے دھچکے سے اپنا سکون کھو بیٹھے ہیں
کانوں میں رس گھولتی آوازیں مخموریٔ رزقِ حرام کے سایوں میں گم -
میں نے کلفت بے درماں میں ان کی پکار سنی - نشّے میں شامل ہوکر
شجرِ مناہی والا دفترِ ارض و سما خاموش ترائی سے وابستہ کیا ۔ دلداریاں
بیتیں ۔ وادیوں میں طوفانِ باد و باراں ۔ ان کی کوزے میں دریائی ہستیاں
میری حد بندی کے شگاف سے چھنتی ، قطرہ قطرہ ٹپکتی شیفتگی سے گھبرائیں ،
نام بدل کر چاندگہن میں نہائیں- کانپیں ، اپنی مدوّر ، شعلہ بہ داماں ذات سے

درس عقوبت حفظ کریں - میں شوق سے جوگیا کپڑوں کے معلوم مدارج جانوں ، شاخ نبات نچوڑوں - بھوکی ، مری، مغموم قرابت داری چھوڑوں - دبی دبی موہوم بغاوت اُبھرے ، تڑپے، سرد ہو جائے - میں کارھوائے عقبیٰ ! جانتا ہوں وہ لڑکیاں کتنی دُکھی تھیں - آج سے ان کی مرکزی چوری اور ہیئت کی نوترتیب ہوائیں دوسرے کھیت میں سونے پر مجبور کریں گی . . .
میں نے کہا : تم اپنی عقیدت میں پابند ہوئی ہو ! کوچۂ گل میں پانی بہنے لگا ہے - نالیاں اپنے گلے کو گھونٹ چکی ہیں- کارپوریشن والے گاہے گاہے آدمی بھیجتے رہتے ہیں ، تم دیکھتی رہنا - وقت پڑے تو شرم نہ کرنا ، جو کچھ بخشوں خاموشی سے لے لینا - دیکھنا آٹھ پہر تاریک ، چمکتے آٹھ پہر - دو دن - ہر دن مضروب چوطرفہ - آدھی آدھی رونقیں اُن کی ، دن کا آل دوالا کالا - میرا رستہ کاٹنے والا خواہش کا گوسالہ بول پڑا ہے - اور مصیبت کا دن اپنے آخری سانسوں پر ہے - اس کے سرہانے دست دعا پھیلاؤ ، مرنے والے دیکھتے تھوڑا ہیں ؟
—— وہ اپنی بیٹیوں سے کچھ کہتے کہتے رک جاتا - اے کاش وہ مڑ کر دیکھنے والی . . . .
چینی کی نایابی کے دن کون نمک نہیں کھائے گا ؟ میں عادت سے مجبور ہوں ، میری گھر والی کا پیٹ اُبھرتا آتا ہے
دن گھٹنے لگا ہے - میری مرضی ، میری تمنا - سات پہر تو ثابت و سالم ، آٹھواں بے عنوان ، نہایت ادنیٰ ، شکل و شباہت کا متلاشی ، پھر بھی آٹھواں، آٹھواں ! پہلا کہیں یا دوسرا ، جو بھی درجہ مناسب سمجھیں دے دیں -

اس کے خد و خال ہمیشہ بنتے اور بگڑتے ہیں ۔ وہ صورت کا پابند نہیں ہے :
گاہے لوتھڑا ، گاہے چمکتا دانۂ گندم ، گاہے زندگی دینے والا درندہ ۔
موتیوں ایسے دانتوں میں انگلی دبائے جو بھی جی میں سمائے کہہ دیتا ہے ۔
اس کی حدیں معلوم نہیں : رات سے ابھرے ، دن سے گذرتا رات میں جائے ۔
صورت کی پابندیاں توڑے ، صورتوں میں بٹ جائے ۔ اپنا آپ چھپائے ،
وضعِ حمل پر گاہے کالک ، گاہے چمکتا دانۂ گندم ، گاہے خواب کے بسترِ مرگ
پہ ریزہ ریزہ ہوتا ، آبرو ریزی کرتا ہیولیٰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دن کا نصف ابھی
باقی تھا ۔ میرا جسم تھکن سے چور نڈھال ، زمانہ کشت و خون میں
لتھڑنے پر آمادہ ! میں نے کہا : میں ہار چکا ہوں ۔ مجھ میں ایک بھی
قطرۂ وحشت باقی نہیں
—— تو اس نے کہا : تم میرے سینے سے لگ جاؤ ، لیکن میرا دودھ حرام
نہ کرنا
دن کی رونقیں ، آمد و رفت ، مصیبتیں ، راستے ڈھونڈنا ۔ دن کو بتانا ۔
نوکری کی پابندیوں میں گھبرانا ۔ روز خوشی سے دفتر جانا اور منجدھار
کنارے بوجھنا خواب پہیلیاں ! گجرے ، ہار ، کلائیاں ، خوشبو ۔ عین سڑک کے
بیچ کھڑا ہوں ! تمہارا ہاتھ کہاں ہے ؟ آنکھیں دکھا دو ۔ میں سپنوں
میں سب کچھ ہار گیا ہوں ۔ رات کی سلوٹیں چرمر ہو گئیں ۔ موٹروں
کاروں کی آوازیں کانوں میں غرّانے لگی ہیں : راستہ چھوڑو ، کیا تم
اندھے ہو گئے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دن گھٹنے لگا ہے ! میں اب رات کو سو جاؤں گا ۔
میری گھر والی کا پیٹ ابھرتا آتا ہے

مجھ سے میرا نام نہ پُوچھو

ان کمروں میں مَیں ہوں
روشن موجیں اور حفاظت کی دیواریں آویزش میں آغشتہ حیرت کی تصویر بنی ہیں !
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو ، میں احساس کنی کا ناشدنی عالم ہوں ! ایک
عظیم تناظر میں اپنی ہی رعنائی کا پرتو ہوں : بیحرکت ! بے لوث قبولیّت
کے دامن میں پاکیزہ آنچ بھرے جذبات جوان ہوتے ہی ، میرا از خود رفتہ
دل ، پہلے روز ابھرنے والے سورج سے ، جسم و جاں کے ریشے ریشے میں
پوشیدگی زندہ کرکے ، رات سویر میں دھو لیتا ہے
میری صبحوں میں سبزے کی سلوٹیں پڑتی ہیں !
میں ہر ایک مصیبت کی تہذیب سمیٹتے جاوں گا : اس کی خوشبو کی پوشیدہ
مُہر شکستہ ہو جائے گی۔ ٹکڑے ٹکڑے پر میری ہیبت کی ٹھوکر کا
اعلان لکھا جائے گا میں خود ٹوٹا پھوٹا نستعلیق لکھائی کی کوشش کا
پہلا مرقع بن جاؤں گا۔ میرے من میں دفن ازل کا تیرہ چہرہ قطرہ قطرہ
حرف حقیقت کی ہستی میں آئے گا
خواہشیں محض اک لمس کی لذت پا کر دھیرے دھیرے چٹکنے لگتی ہیں
اور نسائیت ، ذرہ ذرہ موج تناظر میں تر گردش میں آ جاتی ہے
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو ، روز چھری کانٹے میں صحبتِ لذتِ عصیاں ڈھونڈنا
میرا مسلک ہے
اپنی نیش زنی کو رنگِ حنائے وادیٔ عیش و فنا کا پانی دینا ، پوچھنا : کس

کی قہر آلود قبولیّت کا چشمہ ابلتا ہے ' اور متداول پیرایوں کے جبر و تشدد کی تلمیحوں میں آزاد تلازم بھرنا ' کہنا : صبح کے موتی جامِ تمنائے کون و مکاں کی دُرد ہوئے ہیں ' پورنماشی کی تفسیریں ہیں

میں نے موضوعات نسائیت ایسی گجگجی ہیبتناک جہنم کے عارض کی لَو سے دھکائے ہیں

لفظوں کا ہار بنا کر اس کے گلے مین ڈال چکا ہوں

زرد گلاب سنبھال چکا ہوں ۔ دیکھو کتنا اچھا ہے

ٹھنڈے جھونکے نے گیلی لوحِ جبیں کو چوما ہے

اگلے دن کی بات ہے ' موسم بہت سہانا تھا ۔ میری وحشت فتنے کی پھٹ بہنے والی رعنائی ' دیوانگی ! میں گم گشتہ اپنی ادا میں ناچ رہا تھا ۔ میں نے سوچا ! ایک لکیر چمک کر ڈوب گئی ۔ میں نے دوسری مرتبہ سوچنے کی زحمت نہ اٹھائی ۔ آنکھیں کھولیں ' گھرکی رہ لی ۔ راستے میں جنگل تھا ۔ میرا ٹھنڈا ٹھار پسینہ سوکھ رہا تھا . . . . میں خنجر کھینچتے کھینچتے کھیت رہا . . . . پھر اس نے میرے چودہ ٹکڑے کرکے چودہ طبق پھیلائے . . . . آج مری ہستی کو اس کی ممتا ' مَیں دیوانگی نشّہ ' روز کے روز نیا بندھن ہے

میں نے اسے متبرک سیڑھیوں پر دیکھا تھا ، بیخود !

میں اس کو اس کی ذات عطا کر سکتا تھا

میں کیا ' جو بھی سیڑھیاں چھوتا ' شہد بھری مردانگی سے آراستہ آتا !

دھرت آکاش سمیت زنا بالجبر ہوا

وہ اپنی اطاعت میں گم ، قید مری یکسوئی !

مآخذ

دن آخری مرتبہ تڑکا، چکنا چور ہوا: اٹھائیسواں زینہ، چاندنی، چاند، چہاروان کالا چوغہ، کالک کی تابانی، اس کا اپنے آپ سے بندھن،
میری راجدھانی

ایک نئی آواز جنم لیتی ہے! ساتویں کمرے سے موجودگی میں سرشار، دریچہ کھولتا ہوں۔ گہری تاریکی کے سینے سے آنچ اور سانس، مرے ماتھے پر کانپے۔ دنیا رقصِ فنا و بقا میں گھلتی گھومتی ندّی۔ میں دیواریں پھاندتا، حیران۔ اپنی گرمی میں سُن ہوتی منزل، راستہ! میں رسّی کا اپنے آپ سے برہم بل، اپنے آپ سے لپٹا بل۔ چاند، اور میں، اور زینہ
۔میرے مس کا خیرہ کرنے والا چاند

رگ و پے کی شہادت

کہتا ہوں سنو : نُطق ہلاہل کی فسوں سازی، تحیر کے علوم، اخذِ ماخذ
کا نشور ۔ اس میں کوئی مضحکہ خیزی یا قباحت بھی نہیں
عہد زن و مرد تیقّن کے حوالے سے تو خود مکتفی ہے
جاؤ، کہ اب مُژدِ مژہ گنبدِ واژوں کی ہایونی کی تعین نہیں
رجعت ماقبلِ قبول ایسے نہیں
گوش کی شنوائی کو شوریدگی، شرّ نشید آج تھپکتی ہے، تھکاتی ہے، سلا دیتی ہے
بدماش خموشی کا ہیولائے شب و روز تمناؤں کے مخصوص مقاموں سے
گذرتا ہی نہیں
رات ہی پھر گذرے
نہیں ، رجعت عقبیٰ، مقدر میں ترے کفر کی تقدیس —— بہیانہ تمازت کا سفر
شامل و مشمول ہے ۔ شب ، درد شقاوت سے قلوب ، انتڑیاں، ظن و گماں،
تاکیں ، رگیں ، دھند میں رکھتی ہے ۔ دریں حالت کم مائیگی ، ویرانیٔ گلبانگِ
سحر گالیوں میں بٹتی ہوا کس کے لئے معرضِ تخیئل میں رکھے گی ، بتا
بحرِ معمّر کی تگاپوئے تلاطم سے ترشٹھپ میں ٹھکے شبد ابھر آئیں گے
تنقیحِ چلن ، قحبۂ دیروز کے حلیے کو نکھارے گی ؟ نہیں !
آج صمیمیّت مذبوح بٹے، حصہ بحقدار ملے، لطف کی افراط ہو
مشکوک ارادوں کا گماں لگتا ہے
کیا نتھنے سے تعبیر کی نتھ نتّھی نہیں ؟ — توبہ ہے

ماخذ

اب سونگھنا مسلک ہی نہیں، چھُونے سے گھن آتی ہے ....
ہم اپنے تعلّق کی سبھی سطحیں گنوا بیٹھے ہیں
کیا جانئے کب غلبۂ ہنگامۂ تکوین ہو، خوں ناچنے لگ جائے
مناسب ہے گھروندوں میں رہیں۔ پھول کھلیں یا نہ کھلیں
سوتے پڑے رہنا بہر حال نفاست کی علامت ہے
ذبیحے کا لہو، لہو و لعب، اور دریچے پہ لگا پردہ عقیدت کے تعیّن کا سزاوار
ہے۔ احساس کہ فی نفسہ مجبوریٔ ترکیب ہے، خوابوں سے نگہ بھرتے ہوئے
چھچھوروں کی امید کرے .....
پہلے پہل خواب کی مخلوق نے پتھر پہ نمو پائی
وہی سنگ — غلاظت کا امیں، روندی ہوئی آنکھوں سے دھلوایا گیا
مانا کہ دو لمحوں کی پابند حقارت سے مفر کوئی نہیں، پھر بھی توقع ہی
اٹھا لینا کچھ آسان نہیں۔ جاننے والوں سے مگر قطعِ تعلق کا ہرا ہاتھ مری ذات
عقیدت سے مزین ہے، کسے چھوڑوں؟ کڑی شرط ہے .....
زرتاب فسوں ساز سخن گوئی معکوس مرا بخت! مجھے ہوش نہیں
جامۂ فرہنگ سماوات کھے خواب گھنے پھیلی سڑک، دیکھنا
خواہش کا جلوس آتا ہے — خوشرنگ، جواں سال
کوئی نام سے مانوس نہیں، محض سبب جامۂ موجود میں ہے
آج کی تلمیح تلذّذ میں تشدّد ہے
اگر راستے کے رنج و محن محورِ خودبینی سے مل جائیں
مجھے تیری قسم، عفّت و آدابِ درِ معصیہ کی بھینٹ کروں

ناخن تدبیر نہ لوں - لاؤ ، لہو کانوں کے سناّٹے کو گرماتا ہے
پھر آج ذبیحے کا لہو ، اور گنہگار لہو ، فرقِ مقدر پہ رہے
کیسے دلہن سجتی ہے
سو شکنوں کی تشہیر سے لوگوں نے کہا : اس کے مقدس میں سبھی قدسی
ہیں، معصوم ہیں۔ تحقیق زمیں گیہوں سے بھر جائے گی
مامور من الموت شب تار کا تہوار ہے - جو جاگے اسے غفلتِ مقصود بلا قصد
ملے - چاند سیاہی کی روانی میں گھلے ، مرد میں شہوت نہ رہے
قرب و جوار آخر شب خواہش ژولیدہ نسائی میں گندھیں ، اجڑے در و بام
کی بوسیدگی میں تارنگہ رکھیں ، جواںمرد کی مردانگی تابندہ کریں
نتھنوں سے پیوستگیٔ لمس بپیمانہ تلاطم میں فنا
حیف سماوات کا منظور نظر ننگ زمیں ، ننگ نسا
چار جہت آنکھیں ہیں، مرکز میں وہی لاش! کوئی موت کا ارمان کرے -
کوچۂ احیائے تمدن میں ذبیحے کا لہو عصمت داماں کی شہادت میں دمکتا
ہے - دہائی ہے ، دہائی ہے، دہائی ! میں سمجھتا ہوں زمانے میں در و بام کی
یخ بستگی در آئی ہے ، تخصیص مرے پاس نہیں
جیسے بھی ہوتا ہے رگ و پے کی شہادت میں بسر کرتا ہوں

راستہ چھوڑو

تری تحصیلِ مقامات حقیقت میں بسر ہو ، جو ہوا کے لئے بھوکے ہیں
انہیں چین ملے

گاہے صدف ، گاہے بشر ۔ انفس و آفاق کی تقدیم سے تر دامنیٔ شوق پریزاد
کرے ! آئے ہوا ، آئے خبر : کونسی وادی میں بہاروں کا بدن
بھیگتا ہے ، ٹوٹتا ہے

بندہ بشر بوجھ سکے ! رات سمندر سے گذر دن کی خبر دیتی ہے ۔ روتی ہے ۔
سمندر ، موتی ، شوق کی شرم ، صدف کا سینہ ۔ کیسے آباد جہاں ساز جبینوں سے
خبر اگتی ہے ؟ مٹی میں بسر ہو تو خبر ہوتی ہے کس طور سے
دانے کی چھپی ذات ، پرستش کی طلبگار ، حزیں قلبِ دروں سے ہری آنکھوں
میں بدل جاتی ہے ، ظاہر میں نمو پاتی ہے ۔ باطن کی اساطیر کی سرسبز شعاعوں سے
نگہ پھٹتی ہے ، مل جاتی ہے ۔ تاریک ہرا دن ! مجھے اعمال کی ترغیب کا
احساس نہیں ، میری نگاہوں کے تماشے کے لئے وقت کی ، امکان کی تسبیح کے
دانوں میں بسی خواہشِ تکوین پریشان ہے ۔ چاہوں تو کروں کن فیکون
سے سحر خلق و خلا ، اپنی صبا میں جھوموں ۔ دیکھ لوں زلف نگہ شوق صبا
کو ڈستی ! خود نگر ہو کے رہوں یا کہ جہاں بینی کروں ، میری حقیقت
ہے ، حقیقت میں ہوں ! میں ہوں اور سیلِ حوادث مرے ابرو کے اشارے
سے بڑھے ، اڑ کے تھمے ، تھم کے بڑھے

میری خبر میں ہے شبِ قدر کا ہنگام

تمہیں کوئی خطر ہو تو کہوں : آتی ہواؤں میں ہو سناکی ترغیب ہے
معلوم ہے سب راہیں مرے عکس میں ہیں
اور ہبوطِ رخِ آدم مری تصویر میں ہے
اور زمیں کوئی نہیں
کیسے کہوں جسم کی تہذیب ضروری ہے؟ مرا عکس تمہارا ہے، تمہیں . .
وقت سلامت رہے، تم خیر سے گھر آؤ! مضافات کی گھر آتی بہاروں سے برستی
ہوئی بچپن کی دھنک نے کسے چھوڑا، جو تمہیں راہ ملے - راستے سارے ہیں
مگر ایک زمیں، اس پہ فلک - جب بھی نظر اٹھے گی چھا جائے گی تا حد نگہ
قوس قزح - اونگھتی گلیوں میں ہوا - دور کنارے پہ کھڑا پیڑ پرندوں سے،
ہواؤں سے، درختوں سے، محبت کی کتھا کہتا تھا، چپ رہتا تھا - لوٹ آئے
گی احساس مضافات کی بھرپور ہوا - پیاری ہوا! ڈھولے کو پردیس میں ملیو
تو قدم روک لیؤ، ہولے سے آنکھوں پہ سبک ہاتھوں کو رکھتے ہوئے
سرگوشیوں میں پوچھیو : ہم کون ہیں
پھر چپکے سے کہہ دیجیو : اس روز سے دروازہ کھلا رکھا ہے
—— ہاں دیکھنا، بالوں کو برابر چھونا!
کسی شبدار اجالے میں سحر گیسوئے زرتاب کی تزئین میں ہے
اور زمیں کانپتی ہے
آنکھیں بکھیرے ہوئے مغویّہ حقیقت کے نشاں ڈھونڈتی ہے
نالہ وشیون میں گذر کرتی ہے : بے تاب ہے، بیخواب ہے
سلطانِ تغیّر کے تشدّد سے ہراساں

ماخذ

سبد گل بہ دہن ، بوئے گلستان سخن اس کو بسیجے نہ رکے۔ کیسے بسیجے
نہ رکے ؟ کون بتائے ؟ دُرِ شہوارِ حوادث کی خبر کوئی نہیں
کوئی خبر لائے تو جی اٹھے زمیں : سوختہ دل ، سوختہ جاں
سوختہ جاں بوجھ سکے کونسی مالا میں تشدد نے پرویا ہے
معمہ ہے کہ مغویہ حقیقت کہیں موجود بھی ہے
ایسے نہ ہو میرے وہموں کی صدا گونجتی ہو
کیسی بنی ذات ہے .... تقسیم کے سوتوں سے کلام آتا ہے
اور صبح ازل ہوتی ہے !
تخلیقِ صبا عارضِ گل ڈھونڈتی پھرتی ہے
شرارت سے بنے بالوں کو ماتھے پہ گرا دیتی ہے ، چھُپ جاتی ہے
سایوں میں ، درو بام کے چہرے سے پرے !
سلطنت حسن نظر : چھپتی ، نظر آتی - بصیرت کی خزاں - پھولوں کے در پردہ
زن فاحشہ آباد ! خبر دار ، بدن جھالکتا ہے - چوری چھپے - اندھی عقیدت
کی نگاہوں سے گذر جائے - چھپے - چھپ کے نظر آتی رہے - چوری چھپے - رات
کی منزل میں فنا - دن میں قیامت کی ہوا - ناچتی - گل بوٹوں کے ملبوس میں

یہ میری حقیقت ہے کہ باطن کی اساطیر تغیر کی ہواؤں کو جنم دیتی ہیں
خود بنتی ہیں ، بن بن کے بدلتی ہیں ، تغیر کی ہواؤں کو جنم دیتی ہیں
رو لیتی ہیں

آواز بہت مختلف احساس میں پابند خزاں رفتہ زمیں ہے
تمہیں معلوم نہیں - میری صدا میرے ہی کانوں کے لئے گونج رہی ہے

مآخذ

میں سنوں ؟ کیوں نہ سنوں

مسلے ہوئے غنچے کی چیخوں میں تحفظ کی شہادت کے صحیفے ہیں

متن بولتے ، خود بولتے ہیں۔ خامشی بے معنی ہے

خوشبوئے تغیر سے خبر پھیلتی جاتی ہے ، مجھے ہوش ہے !

امروز ، کہیں خانۂ ظلمت میں پھٹا ، چاندنی کا روپ گیا ، دھوپ نکھر آئی

ہمیشہ کی فضاؤں میں شب و روز کا آغاز ہوا

آؤ ، مرے پاس رہو

میرے تمہارے دل و جان شومیٔ تقدیر سے اب ایک ہیں

جو مختلف اقدار تھیں ، قربان ہوئیں

آج اساطیر نہایت کو پہنچتی ہیں !

میں آزردہ ہوں۔ دن رات اسی طور پہ گذریں گے ، گذر جائیں گے

وادی کی ہوا میرے لئے گیت نہیں لائے گی۔ میں سوختنی قربانیاں دوں ؟

کیوں نہیں ؟ افلاک نگہبان زمیں دیکھتے ہیں۔ پوچھتے ہیں : کیسے بسر ہوتی ہے ؟ آباد نہیں کون و مکاں، کیسی مصیبت ہے ؟ زباں کھولو ، کہو ، کہہ بھی چکو . . . زندہ سزاواریٔ جذبات نہیں۔ کہنے کو صدیوں کی زباں کہتی ہے، معلوم نہیں ! دیکھتا ہوں ! رات مری جان کی تعبیر سے خلعت کو جلا بخشے گی۔ اے لوگو ، ٹھہر جاؤ

مری موت کے آنے کے لئے راستہ چھوڑو

ظرف و علامت کا جہاں — پھول ، ہوا

آواز عجب عرصۂ ہمت کی ثنا خواں ہے
مرے پاس زباں ، شوخیٔ گفتار کی تلقین سے خوابوں کا بہشت
اور گلی کوچوں کی پابند سراسیمہ حرارت ہے - زباں درد ہے
ملنے کے لئے کس کے گھروندے میں فراموشیٔ احساس بھروں ، اور مقدر کی
سیہ رات کے دامن سے طلوعات سحر مانگنے جاؤں ؟ مجھے اس روئے پرستاریٔ
خواہش کی تھکن ڈھونڈ چکی !
پھر گھنے انسانوں کی تاریکی سے خوشبوؤں کی بے باک شرارت کا دبستان
کھلا - دیکھئے ، تاریکیٔ اشجار کی خواہش زدہٗ آنکھوں میں کرامت کی
عفونت کا گنہ ، شورش رنگینیٔ قدرت کا بدن چومتا ہے - کون سی حاجت سے
مصیبت کو جدا کرکے کہوں : میں نے مقدر سے کبھی راز چھپانے کے لئے
عہد کیا تھا ، مری محبوب کے سینے کی جواں پسلیاں جل جل کے سیہ
ہوتی ہیں ، کاجل سے بھنویں رنگتی ہے ، چپ رہتی ہے - کہتی ہے تو
بس اتنا کہ تم میری محبت میں . . . . .
جگر کاوی پہ شرمندہ ہوں - تائید کی تقریب ہے - کس شخص کو پھاٹک
پہ کھڑا دیکھتا ہوں - کون ہے ؟ اس شہر سے ناواقفی کی دھوپ کسے
چومتی ہے ؟ کوئی بھی ہو ، رات کی ذرّیت گم گشتہ میں ہنگامہ ہے -
کہرام کی دھندلائی فضا جسم سے اٹھکیلیاں کرتی ہے - ذرا دیکھو ، وہ
بیچارگی میں دفن عجب شخص کسے ڈھونڈتا ہے ؟ اس کی توجہ کے مراکز

میں فقط تیرگی ہے ۔ روشنی تا حد نگہ پانی کی مرقوم رداؤں کو اسالیب نہیں بخشتی ۔ کیا رنگ و نوا نعمت بے نطق سے آگاہ کریں ۔ میں تو فقط چاھتا ھوں۔ چاھنا پا لینا مگر ایک نہیں۔ اور یہ ترتیب مرے بس میں نہیں ۔ اس کی بھلی پوچھی ! اسے کوئی سلیقہ ھی نہیں ۔ ورنہ میں جس طور سے ہر رات عقیدت کے دبستان میں خواھش کو ملاتا ھوں . . . . .
خبردار، مکافات کے خدشات سے دلگیر نہ ھو ۔ رشتۂ اوقات سے چادر کے کناروں کو الیڑھ ! آج مجھے مطلعٔ اغیار نے خوں رنگ شناسائی عطا کی ہے ۔ دلازای پریشان کئے دیتی ہے ۔ خورشید خنک خشخشی داڑھی کے تناظر میں تڑپتا ہے ۔ جواں موت کی خوشبو سے دماغ اپنی وجودیّت گلنا ک بدلنے کے لیے جھومتا ھے ۔ شرف ملاقات زباندانیٔ احوال نہیں ۔ روشنی تہراتی پیمانہ ارادت کو ندامت کے لبادوں میں چھپاتی ہے ۔ قریب آؤ ، مرے گھاس کے میدانوں میں بھیڑوں کے زمیں چومتے ریوڑ ھیں ۔ میں دھو دھو کے ترے پاؤں ، تجھے شب کے سرافراز تناظر سے بھروں ۔ کیسے کہوں : تیرے لئے رات کی وادی میں زمیں سوسن و ریحان سے شاداب ہے ، آ لذت محبوبیٔ لالہ سے بدن پوش برانگیختہ صحبت سے جبیں پونچھ !
سمجھ ، شہر کے چوگرد سمندر پہ اگے خیموں کی تا حد نگہ آنکھیں حیاتی کے سجے کمروں میں در آنے کی تدبیر میں ھیں ۔ داخلہ ممنوع نہیں ۔ وحشی طلسمات کی یلغار ۔ سفید آگ سے دھرتی کی تر و تازہ بہاروں میں خزاں دولت افلاک چھپا دے گی ، کشاکش کی سیہ مٹیوں پر گیتیاں کھیلے گی ۔ خیال آدھی حقیقت کا خزانہ ہے ، شب و روز کے امکان میں ھیجان زدہ

مآخذ

نصف ملا ! کوہ و بیابان سے لوگ آئے ہیں، مٹی کے سمندر میں پریشان
کھڑے سوچتے ہیں : شہر میں کیا لذتیں ہوتی ہیں ؟ تمنا سے بڑے لفظ
کی تجسیم سیہ جشن کے مابعد نہ لے جائے گی ؟
اے چلتی ہوا ، کوہ و بیابان کی شرمندہ عداوت سے بدن بھر کے نگاہوں
سے گذر ۔ راستے کو ڈھول بنا ۔ نفس کی امّارہ قدامت کے لئے مشکلیں
تہذیب طلب تیرگی ہیں ۔ بھوکی خوشی ساری گذرگاہوں سے ہو آئی ہے ۔
تعظیم کی مسند کے لئے کوچہ و بازار میں کوئی بھی نہیں ۔ مرے شگوفوں
کی مہک دکھتی رگیں چھیڑتی ہے ۔ دیکھ کے چل ! کاسۂ احساس ، تہی موج
کا اعلان نہیں ۔ گھومتے سایوں میں سرابوں کی سحر ناچتی ہے ، دل کی
ہوس رانیوں میں خوف ملا ! دھندلی شبیہوں کی لکیروں میں تھرکتا ہوا
پارہ ہے
تجھے گذرے ہوئے سالوں کی خواہش تو نہیں ؟ میری جبیں جنبشِ اطوار
سے توبہ کی پرستار ہوئی جاتی ہے ۔ روکو ، مجھے پرہول شبیہوں کی
شباہت پہ تراشیدہ ارادوں سے بلکتی ہوئی ممتا کا خیال آتا ہے . . . . برسات کے
موسم میں زمیں اپنی کہانت کو چھپا لیتی ہے
منہ ہاتھ دھلاتی ہے ، مگر داغ نہیں دھلتے ۔ کہیں کوڑھ نہ ہو ! . . . .
غسل کا آغاز کریں ۔ موسمِ گل آتشِ لالہ سے ہویدا ہے ۔ نگہ جلتی ہے ۔
میں بھول بھلیوں کے اچنبھے کا پرستار نہیں ۔ لذتِ بیگانگیٔ شوق نہ پوچھ ۔
آج کئی لوگ مری موت کے رستے پہ گئے ۔ قرب و جوار ان کی عقیدت
کے ثمر ۔ کیسی حقیقت کی برانگیختہ مجبوریاں

آفات کے سو ہاتھ ہیں ۔ تائید ، مرے لفظوں پہ بہتان ہے ۔ میں راندہ و
بیکار تکلم کا ظہور ۔ اس کے لئے لفظوں کا ملبوس بناتا ہوں
ـمجھے تیرگیٔ مرگ کا احساس ہوا
خواہشِ لبیک سے کس مردِ مظاہر کو ملوں
مرنے میں تکلیف و تردد کا چھیالیسواں حصہ ہے
فسوں ساز جھمیلوں پہ جبہ سائی میں تکفین ہے ۔ صورت کی تجلی سے بدن
بھیگ چکے
ہجر کے مضموں میں تشبیبِ ملاقات مرے دیر و حرم گردشِ دوراں سے
بھسم کرتی ہے
بارش کے دھلائے ہوئے پتھر پہ جو بنیادیں اٹھائی ہیں . . . .
سراسیمہ نگاہوں میں شقاوت زدہ بھُرائی عزاداری ہے ۔ دیواروں کے پچھواڑے
میں خاموش سلگتا ہوا منظر ہے ۔ ابھی کانٹوں میں روئی کی طرح چھچ
کے چمٹ جائے گا
تو فخر و مباہات کے امکان دکھائے تو بصد شوق تری زلف کے تاریک
بلاوے پہ قدم روکوں ۔ تجھے پوچھوں ؟ نہیں ! سیدھا ، تمناؤں کی گوندھی
ہوئی مٹی سے ظروف اور علامات کی تخلیق میں لگ جاؤں
مواعید میں بوسیدگی در آئی ہے
منظور نہیں شہرِ ملاقات سے دل بستگیٔ کہنہ کی تجدید ! مرے دور کا
لاریب چلن اور ہے
اخلاق رگ و ریشہ میں انگیختہ صحبت سے زمیں کانپتی ہے

سایۂ اشجار میں گھل مل کے اچنبھے کی زیارت ہے !
تری ذات کی گمنام خوشی ! ہستیٔ مابعد رخ وقت پہ زلفوں کی بکھر
پھیلتی امواج ۔ مگر ، کون قبولیتِ ماقبل سے مابعد کی رجعت پہ جمے ؟
میرے قدم اکھڑے چلے جاتے ہیں
خوش خلقی و بیزاری سے ہر آتی مصیبت کو پسندیدگی کا روپ عطا کرتا ہوں ۔
آغاز کی آواز کو سن ۔ دیکھ مقدر کی زمیں پھوٹی، فضا مہکی ۔ گل و لالہ کی
تزئین ترا نام ہے ۔ میں نام نہیں ، قوت شادابیٔ اقرار ہوں !
کیوں اپنی طبیعت کی خرابی سے حذر کرتا ہوں ، معلوم ہے
تو چاندنی میں لیٹے گی ، اور جسم کی مشکوک شرافت سے کئی لوگ ترے
نام کی تعبیر میں ـ ہاں کارگہہ عمر کی پابندی میں کھو جائیں گے ۔ بازار
میں سرخی کے بہت عمدہ برینڈ آئے ہیں ۔ کیا رنگ شفق پھیلا ہے !
پھر کس لئے اولادِ عقاید سے ہوا دامنِ دل باندھتی ہے ؟
رات ہوئی ، قافلہ چلتا ہے
زمیں ذروں میں بٹتی ہے
خبر خاک بسر پھیلتی جاتی ہے
کہو ، وقت کا شہوار کہاں ٹھہرے گا
اس لمحے سے اس لمحے کے مابین کٹھن منزلیں ہیں ، راستے بے انت ہیں
اور موت فقط صبح کی تمہید کے غازے سے نمو پاتی ہے
اے خاک ٹھہر ! غازۂ دل
دیکھ، زمین انت سے بھرپور ہے ! موجوں کے خرابات دہن چومتے ہیں

ماخذ

رات جہاں مدفن گل دیکھتی آنکھوں سے لہو ٹپکا تھا ' گل بوٹوں کے ملبوس ہیں! مدفن کا بدن اُگتا ہے - مفہوم رسائی سے گریزاں ' قدم آباد - زمیں سبزۂ نورستہ میں چھپ جاتی ہے - پشمینۂ اندوہ سے چہرے کے چراغوں میں سیاہی کی لٹیں کھیلتی ہیں - چلتی ہوا ' خواہشِ ابہام جگا ! اور شفق صدیوں کی چادر پہ لگا

آج کی آواز ' تذبذب کی زمیں تہمت ایام سے مجروح کئے جائے گی - واماندگی و بخیہ گری لاکھ سہی ' یہ بھی کوئی کام ہوا ! . . . . . کار جہاں جلوۂ نوروز نہیں - دھوپ اجڑ جاتی ہے ' رات آتی ہے : اشجار سے اوقات کے جنگل کا خزاں رفتہ ' پراسرار گذر - راستے معدوم ہیں - جو کل میں نکل جاتے ہیں ' پھر آتے نہیں - بھول بھلیوں سے انہیں راستہ ملتا ہی نہیں - سامنے میدان ہے - پاکیزہ ' کنوارا ' جنم اشنان کی خواہش کا سیہ چشمہ - زمیں خواہشِ روئیدگیٔ لفظ سے معمور ہے - قدرت کا سیہ لمس جگا - اجڑے خیالات کی متنوع جمادات سے دل گیر نہ ہو - رات جو محبوب کے مرنے کی ہوس دل میں چھپی رہتی ہے ' صدمات کا ہیجان ہے - پھولوں کو مسل دوں تو ہوا جاگ پڑے - آندھیاں سنّاٹے میں پتّوں کی زباں قتل کریں - رنگ شفق دھونے کو الفاظ کی بے جان تہیں کھلتی ہیں - ابرق میں بھٹکتی ہوئی آنکھیں ہیں - لہو رونے کو دل چاہئے دل ! دل میں دبی رُت سے گلستاں کو بسا - ظرف و علامت کا جہاں ' پھول ، ہوا

فقط سامنا ہے

مقدمات اس کی آرزو کے غلط ہوئے، مٹ گئے رسومات کے مسائل، میں کیا کروں
رات روشنی کی گداز باہوں کو چومتا نرم رو زمانہ الجھ پڑا تھا
وہ آنے جانے بہار کے بادلوں کے سائے کہاں ہیں
میں اصطلاحات کی نئی کونپلوں کی خوشبوئیں سونگھتا ہوں۔ عجیب
قصّہ ہے

کوئی آوازۂ سحر تاب سن سکے تو——
میں اشتہا کے طلسم کی خوبرو کہاوت پہ کان رکھنے کی استطاعت میں
دربدر پھر چکا ہوں۔ شاید مجھے پرانی حکائتوں سے سراغِ خوشبوئے کشمکش،
وحشیانہ امیّد واری، سکتۂ تعیّش سے اطلاعِ طلوعِ شب ہو۔ میں اپنی تردید
سے گنہگار سرگذشت آج کہہ سناؤں گا۔ میرے اعمال پر زمانوں کی گرد ہے!
دن کی دشتناکی پہ دُرد آلام سے بھری موج سے چڑھی ہے۔ اداس، یکرنگ،
آمد و رفت باد ایام سے گذر! وقت یاد کر۔ واژگوں، دگرگوں، مقام
تضمینِ حالَ و مَاضی۔ میں کیا کہوں، جھاڑ پونچھ بے فائدہ ہے۔ سینے پہ
تر سرائے ہوئے پسینے میں عکس محبوب، ہستی و نیستی کی موجیں۔ جھلک
تڑپتی ہے۔ نطفۂ خور کا آسماں چوڑا چکلہ سینہ۔ میں کس لئے نطقِ مرمریں
جسم و جاں کی لذت کی روشنی کے لئے بہاتا رہا ہوں۔ کیا لفظ میرے منہ
پر سجے نہیں تھے۔ مگر جدائی کے سخت وقفے میں اس کی آنکھوں کی بے بسی:
بے زمین انسان کی مصیبت کی نوحہ خوانی

ماخذ

میں شورِ شہرِ بدن میں ڈوبا ہوا پرندہ ہوں
بعد مدت کے وقت سطحِ خیال پر کھینچ لایا ہے
دن بدن بدلتی مہیب ہوتی حقیقتیں دائرے کی گردش میں آگئی ہیں
میں زندگانی کے خوشنما پیرہن کو خاکستری ارادوں کے ہاتھ میں دے
چکا ہوں
لیکن مرے دیارِ مصاحبت میں کئی دنوں سے تنازعہ ہے
میں اس کی ترغیب کے بدن کی بہار کو لوٹتی ہواؤں کو دیکھتا ہوں
کہیں بھی اب تختِ خاک خوابیدگاں پہ پھولوں کی سرد چادر نہیں رہی
اس کے جسم و جاں کے عذاب لذت میں روز روشن چھپانے والے، خبر ہے بیداد
کارگر ہے۔ مگر پسینے میں ڈوبی دنیا پہ میری حقدار آنکھ مرتی ہے

دیکھتا ہوں، مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ مرے سامنے فقط سامنا ہے، اور سامنے کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔ نہیں نہیں، سامنے کے اندر بھی کچھ نہیں۔ رات ـــــ آرزو کی مہین بانہوں میں ابتدا انتہا کا وقفہ، تمام ہستی مچل رہی ہے۔ نہیں نہیں، کہنے والے خوش بخت کی زباں پر سفید پرھول چاندنی میں بجھی ہوئی گفتگو تھی۔ میں حرفِ مدعا تھا۔ مرے تلفظ میں بانکپن تھا نہ روشنی تھی۔ فقط ارادوں کی بے محابا طلب: زمیں صحبتِ دمادم کی انتہا پر محیط، مد و جذر۔ میں کہنے کی آرزو میں فنا

انہی دنوں میرے زرد چہرے پہ بے حقیقت زمیں کی تحریر تھی
نگاہوں کو جذب کرتی حسیں زمیں کی تمام وسعت تمہیں میسر تھی
یعنی، مجبوری و حضوری میں اپنی اماں کی گود سے لے کے آ چکا تھا

ماخذ

میں کیا کہوں ، میں نے اپنی ہستی کے گرد و پیش اس کی آرزو میں بسر
کئے ہیں
ابھی تلک رات کا حسیں شہرِ صد بہاراں غبار سے جگمگا کے نکلا نہیں !
تکلم کی پیش رو بے بسی کی پھٹتی مزاحمت ۔ میں نے اپنے اعصاب کی طنابیں
سمیٹ لیں ۔ مرحلے کی از حد نئی نویلی مزاحمت، میری بے بسی ۔ رات دن کے
ادغام پر چمکتی لکیر ابھرے ۔ میں رات دن کی مفاہمت پر زبان رکھوں ۔
زبان رکھتے ہی لفظ ڈھونڈوں ۔ کہوں تو کچھ اور بات نکلے ۔ جو بات
بدلوں تو لفظ کھو جائیں ۔ لفظ پاؤں تو رات دن کی مخالفانہ حدود مٹ
جائیں ۔ کیسی مشکل میں پھنس چکا تھا ۔ فقط مرے روبرو مرا سامنا تھا ،
میں تھا ۔ نہیں نہیں ، میں نہیں تھا : صبح و مسا کا وقفہ ! تحیر اس کی ادا سے
پھوٹے ۔ زمانہ تقریبِ زندگی کردن اس کو بخشے ۔ مین اپنی دمساز خواہشوں
پر خوشی غمی کے نشان لگاؤں ۔ کہوں : تمہی صبحِ عافیت ہو ۔ میں خالی
ہاتھوں سے بارِ انجیر مانگتا ہوں
ـــــ مگر مرے سامنے فقط سامنا ہے

The imperfect is our paradise.
Note that, in this bitterness, delight,
Since the imperfect is so hot in us,
Lies in flawed words and stubborn sounds.
—Wallace Stevens

ماخذ

سمندر امڈتا رہے گا

اُس کی آنکھوں کی حیرت زدہ نارسا روشنی میں فلک جھانکتا ہے

ابھی رات باقی تھی میں نے کہا : وہ اطاعت میں دھرتی ہوئی ہے !

مرے دھیان کی لہر پھولوں کے دامن پہ پھیلی ، صدا بن گئی

اس کے مالک نے سوچا : تو کیا صبح بھی ہوگئی ؟ خیر . . .

دروازے کی اوٹ سے میں نے دیکھا : عقوبت ، عقوبت ، عقوبت

شرابور لفظوں کی عیاش یُورش - رخِ صبح بھونچال ارض و سما - موجِ معنی کا طوفان - دمِ واپسیں - کشت و خونِ جنم بھومی ؛ ملکِ دن رات - شق القمر - رقصِ ناچیزی ؛ مطلع الفجر ، یخ بستگی - کون ؟ میں ! میں نہیں - کون ؟ تو ؟ تو نہیں - کون ؟ میں تو - ہمیں نورِ نوشب سے ، ترکیبِ نحوی کا چوری شدہ بھیدِ بربادی ؛ قلب و جاں مانگتا ہے

مگر ، وحدت قلب و جاں سے شناسائی اس کا مقدر نہیں - کیوں نہ میں پھول میں ڈال کُندن کروں ؟ معرضِ شورش باکرہ - روز سنجوگ آغاز و انجام - ناپید ہوتی ہوئی ، راسِ رسم و رواجِ بتانِ حرم ! نورِ پھلواری ؛ پیشگانِ من و تو - تنک بخشی ؛ آگ و خاک و ہوا و ہوس - تم کہاں تھے ؟ مجھے موت نے آ لیا ہے - مرے رس بھرے جسم و جاں میں سرشتی کا ہنگامہ - کشتی کو سنسان میدان میں کھینے والی ہوائیں ، رگ و پے کے سبزے میں قہر و جلالِ جہنم کی حدّت ، بتاؤ : تمہارے لئے کون سی چیز لاؤں ؟ مزیدار رس گلے یا سنگترے ؟ موج کے دوش پر نیلگوں بلبلہ گھر کی

پرچھتّیوں سے گذرتا ہوا فرش پر لیٹے انڈے کو چھونے ہی والا ہے۔
پکڑو! پکڑ لو، پکڑ لو! گیا، وہ گیا! فرش سے جا لگا۔ پھٹ گیا،
پھٹ گیا . . . . فرش، آنگن، رسوئی، سفیدی سفیدی سفیدی، سمندر۔
فلک دھند موجیں۔ سمندر میں ادوار۔ معروضی دنیا پہ تحریر سادہ کا امکان۔
مشیّت کی سڑکوں پہ آوارگی۔ قحط گندم، لب لالہ وش، لن ترانی۔ ہوا میں
چھپے جسم و جان کی سہولت پہ قربان ہوتی مصائب کی گرد و غبار گھن آور
بھی مغموم ہے۔ ٹیکسیاں . . . . ٹھہرو ٹیکسی۔ کہیں جاؤ گے
جی نہیں!!
ننھے منے کہاں ہو؟ تمہیں جھاگ پانی ہوا میں لگے سات دن ہو گئے۔
ٹیکسی والا کھڑا ہے، بتاؤ تمہارے لیے کون سی چیز لاؤں؟ مزیدار
رس گلے یا سنگترے؟ دیدہ و دل کی پہنائیوں میں تمنائے کم مائیگی کے
شرر ناچتے ہیں۔ میں پرہول تاریکیوں میں تب و تاب تہذیب حظ آفریں۔
خد و خال رعنائیٔ جستجو کے دھندلکے! منازل کی تجویز کردہ حدیں۔
اب قدم رنجہ فرما! مرے ساتھ صدیاں ہوئیں تیری خوشبو ہم آغوش
ہوتی نہیں۔ کہہ، تجھے داخلے کے لئے کون سی فرد مطلوب ہے۔ ننھے منے
بتا، جھاگ پانی سے تو بلبلے ہی بناتا رہے گا؟ کنول جھولتا ہے۔ کتاب
اور پاؤں ٹکانے کی وحدت، چمن۔ میرے تن من کی وحدت میں سو وحدتیں
۔ ہفت اقلیم مردانگی۔ سیر گاہ کشادہ، روش در روش پھول کلیاں۔
ریاضت۔ قدم کا سہارا زمیں: سات مردوں کے دروازے کے درمیاں
دُھنیٔ دھرِ مستور۔ خوشبوئیں، جادو، نسائے نشور۔ آدمی، ہفت افلاک و

اقلیم و وحدت سے لپٹا بنا، مَیں ! شگاف در آب و گل سے گذر منزل آب و گل میں فنا ، پھر ورا عالورا عــ بلبلہ ! بلبلہ اپنی دُھنی پہ چکرا گیا : اس کی دُھنّی کے اوپر دوئی ، اس کی دُھنّی کے نیچے دوئی ، دائیں بائیں جوانی کی مردانگی ۔ آب آغاز کی گود میں بلبلہ ! واہ وا ، خوب ۔ کتنے ھی رنگوں کی جولانیاں ھیں

مگر چار سُو ناگزیری کی دیوار ہے

میری آنکھوں کے آگے فصیلیں !

اگر میں کسی مملکت کا فرستادہ ھوتا ، تو صدھا نئے تحفے لاتا ۔ مگر میں

وھی ھوں ۔ میں اس رات کی بات کرتا ھوں جب ھم اکٹھے تھے

لیکن زمیں تا فلک بار آغاز و انجام ھستی کی تحریر زا، سرمگیں چادر، ماجرا !

میں نے دربان سے بھی کہا تھا : یہاں مرغِ آغاز سیمیں کی آواز آنے نہ پائے

میں شرمندہ ھوں ! میری آنکھوں کے آگے زباں کی فصیلیں ھیں

دمدار تارا اُبھر آنے والا ہے

آنگن میں صبحِ تمنائے شب ، شبنمی شور سے پھول چنتی نکل آئے گی

دیکھو پانی میں تھراھٹیں ھیں

سمندر کے سینے پہ افلاک جھانکیں، نہائیں ــ نگاھوں کے ریلے میں چھینٹے اڑائیں

شجر بارور ، بارور ، بارور

نیلے نیلے غباووں کے اندر ھوا کے سوا کچھ نہیں ، کچھ نہیں

پھر بھی کانَ ذھوقاً ئے معنی مرصع زبرجد پہ تحریر ہے ۔ میری قہر بلوغت کی دیوانگی جملہ اوصاف کی ایکتائی کو سو لخت کرتی ہے ۔ مایوس ھنگامہ ،

تقریب ہموارگی ، لذتیں سر بکف ۔ وصلِ جنگ و جدل ۔ کوئی کہہ دے :
ندا ، شورِ شبخونِ وحدت کا جادو بھرا جزوِ لا ینفک و مستقل ہے ؟ میں
کہتا ہوں : تسخیر و تفسیرِ مرد و زنِ روزگار مشین آج ہستی کی نص صحیفہ
صفت بن چکی ہے ۔ شعور آختہ لذت و معنویت کا تازہ طلوعِ ابد ہے ۔ تجھے
کیسی تائید کی آرزو ہے ؟ بہاریں مخفف تشدّد کی گلکاریوں سے مزین ہیں ۔
آنکھیں نہیں جھیل سکتیں مگر جھیلتی ہیں ۔ سواد حقیقت مساوی جدل ۔
میری ژولیدگی شہر خوباں کا جھنجھٹ ۔ مدارات مفہوم تازہ تھکے ہاتھ
پاؤں کی آسودگی ذمے لیتی ہیں ۔ لیکن مکمل مداوا مرا دردِ سر ہے ۔ تو
انکار سے باز آ

دیکھ نارنگیوں پر سراسیمہ کیڑے کی وحشت زدہ بھاگ دوڑ !
اشتہا ، خوف ۔ جاڑا گیا ۔ مینہ برس بھی چکا ۔ پھول ہی پھول ہیں
میری شُبھ کامنائی کو حالات حاضر سے تشویش ہے
میری معذوری ، خودگراوٹ مگر ظلِّ اخلاقِ مور و مگس کی مکافات ہے
میں تجھے خوب آکھم ، مرا بد بگو ۔ تاکہ دنیائے صابون و رُوج اور پوڈر
کا خوشبو سے خالی کرائی‌سینتھی‌مم جگمگانے لگے ۔ لا اٹھائے موجود و
ضربت زدہ مجھ میں تجھ میں ہویدا ہوا ۔ طرفتہ العین گھناؤ ۔ افتاد ہتھیار بندی
ہوا کا نوشتہ ۔ ابھرتے فنا ہوتے آتش فشاں پھول ۔ مردانِ شور و شغف
اشتہاری سکوں کے حواری ہیں ۔ کہتے ہیں : موسم وہی ، ہم وہی ،
خوف و دھمکی سے کیوں کر مریں . . . .
آج میمیلیا کے بھیانہ اوقات کے راستے مرد و زن کے لئے کھل رہے ہیں !

کوئی بحرِ افراد تاریک باقی نہیں - کالے مغلوب سایوں میں روحُ القُدس عود کر آئی ہے - رات میں دن کی روشن لکیریں - سمجھ تُو اگر دھوپ میں جل کے کالی ہوئی ہے، تو کیا ہوگیا - تاک پھولے ہیں، انجیر پکنے کو ہیں، تو بہت خوبرو ہے

ذرا لقمۂ بے بسی کو نگل، میری محبوب کی چھاتیاں شیرِ مادر سے بوجھل ہیں - لیکن ابھی اس کی چھوٹی بہن کیڑی کاڑے میں مصروف ہے - میں سمجھتا ہوں : اس کی جوانی سے حشر و مکافات—سمجھے ہو، وہ اپنی منگنی بلوغت سے روندے گی - اس کا اپاہج دوروں ایک وحشت بنے گا - قوی ہیکل، اندوہ و لذت بھری مردمیّت کے بیروں کو، آج کل کی اپاہج مگر آنے والے دنوں کی توانا دروں باشیٔ ارض ممنوعہ، ٹھکرائے گی - پیٹ کا ہاتھی دانت اور نیلم کے نقش و نگار اجنبی کو پکڑ لیں گے - وہ موت کی مچھیاں برسرِ عام لے گی، پلنگ سبز، خلوت کدے

—کھولو دروازہ

تم کون ہو ؟

—اجنبی ہوں

نہیں، میں نے کپڑے اتارے ہوئے ہیں

—مگر میں تو آغاز کا لمس ہوں

میں سمجھتا ہوں : اس کی جوانی سے حشر و مکافات، لہو و لعب، قہرِ آدتگی—حرف ابجد سے تمت تلک کال ہی کال، ہاں کال ہی کال

کوّے سبھی کالے کالے - بنیرے پہ کون آیا ہے

مآخذ

کوا ہے ! کائیں کائیں کئے جا رہا ہے

تو پھر کوئی آئے گا ؟ کہتے ہیں کوا خبر لے کے آتا ہے ! اے ننھے منے
بتا ، آنے والے سے تو کیا کہے گا

اہا ! دیکھو کتنا بڑا نیلا نیلا غبارہ بنایا ہے ؟ وہ اڑ گیا اڑ گیا ، پھٹ گیا
گولیاں کھٹی میٹھی کبھی لائیں نا ۔ وہ جو مُنّی ہے اس پار والوں کی ،
ہر روز اسکول میں گولیاں کھاتی رہتی ہے ۔ جو چیز مانگے میں دے
دیتا ہوں ۔ آپ بالکل چکھاتی نہیں ۔ اتنی بھوکی ہے !

چہرے پہ عہد خزاں گیر کا برزخ نادمیدہ لکھا ہے ۔ تعلّی نہیں ۔ کارواں
تانگوں کے مابین وقتوں کا جمّ غفیر ۔ اجتناب من و تو کو شوریدگی کی منازل
تلک چھوڑ آتا ہے ۔ جب لوٹتے ہیں ، قدم لوٹتے ہیں ۔ زمانہ کانپنے لگا ہے !
در و بام ہمسائے کی لاشِ ہیبت فزا کے ہیولے میں ہیں ۔ خوف و تنہائی و
خامشی کے گرانبار سائے میں خواہش نہیں ، بے بسی ہے ۔ فقط آج کی
رات ٹھہرو

پس پردۂ بام و در خونچکاں داستاں کا معظّم مہاتی اظہار ! اصلِ اصول اپنی
کلّی صداقت کو دھراتا ، ماضی سے امروز کی سرحدوں میں سمٹ آیا ہے ۔
آؤ ، دھندلے زمانے کی تمثیلِ مادیّت واقعات آفرینش کے سیّال میں ڈھونڈ لیں ۔
آؤ ، کوشش تو کر دیکھیں

موصوف کشتی چٹانوں کے سفاک جبڑوں میں لاتا رہا
تیرگی چھیدنا مرگ آغاز و انجام ! سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی وہ کشتی
چٹانوں کے سفاک جبڑوں میں لاتا رہا

چٹانیں تشدّد سے اس کا ارادہ کچلتی رہیں
اس پرانمارڈیل معرکے سے توارد کی تعبیر ہو تو بچاؤ ہے، ورنہ۔
زمانے کو فوزالکبیرِ اھنسائے دستور و قانون، تزئین کے نقش ہیں
دھوکے بہنے سے کیا پائیں گے
ہُن کے دیوان بائیں رکھیں یا کہ دائیں، سمندر امڈتا رہے گا
چٹانوں کے جبڑے سیاہی کی آغوش روکے رہیں گے
سیاہی! سیاہی! جدل غیرانسانی جد و جہد کا سزاوار ہے
آؤ، خون اور بے خون کی سرحدوں کو ملائیں
تعلق کی فینٹازمگورک نہیں کرن فکانِ جہانِ من و تو میں لائیں، جئیں
پھر کرائی‌سینتھی‌سم رونقِ آسمانِ معانی کا مظہر بنائیں
ھوا رات کی بوندیں زلفوں میں ڈالے
تمنا میں صہبائے منسارِ صحبت چھلکنے لگے
بیچ پھیلاؤ کی سرحدیں۔ حد نگہ تمنا سے ٹکرائیں، کُل ھوتی جائیں
بتا سانولی، سوت کی اٹیوں سے تو کب تک
پنلپٹی عشّاقِ معنی کو پسرِ فراقِ پدر سے تصادم میں رکھے گی
کل گھوٹو جذبوں سے جینا اجیرن ہے
صبح و مسائے تمنائے عشّاق طے ھوں یا انکار ھو
کچھ بھی ھو، فیصلہ ھو
رہ و رسمِ منزل سے بیگانگی تختۂ دارِپسرِ فراقِ پدر ہے
نئے بیل بوٹوں کی تخلیق میں پورے بارہ برس ھوگئے۔ آنے والا نہیں آئے گا۔

آئے گا! فیصلہ تیرے ہاتھوں میں تحریر ہے۔ لوحِ محفوظ، عشّاق معنی
و پسر فراقِ پدر کو برابر کی تکلیف دیتی ہے۔ کیا میرا احسان کوئی نہیں؟
یاد کر کس نے تیرے لئے سونے چاندی کے زیور بنائے، بتا کس کا بایاں
ترے سر کے نیچے رہا۔ کس نے دیوار کے پیچھے رہ کر تجھے کھڑکیوں
سے ڈرایا، گلے سے لگایا۔ ذرا یاد کر کس کی آمد ظہور سویر عدم تھی۔
دھوئیں کا ستون کس کی خاطر بیابان سے آتا تھا۔ ہاں یاد کر تو نے کس
کی محبت میں دیوا و در کو مرصّع کیا تھا، بتا . . . . ہاں مگر میرا احسان
کوئی نہیں۔ سب کے سب تیری آواز سنتے ہیں، لیکن مجھے تو سنا
کتنی شیریں ہے!

کونپل کھنڈر کے گرانبار انبار سے پھوٹنے کو ہے۔ دیکھو تو، دیکھو تو،
پھوٹ آئی ہے! تم بہت خوبرو ہو۔ زمانے کی چلمن گرا دو۔ مرا رابطہ
مشفقانہ نہیں۔ ہاں مجھے بابِ وحشت سے در آنے دو۔ میں بہیانہ تندی کا
پیکر ہوں۔ آؤ کہ وحدانیت زا فراموشی آب و گل ہے، زن و مرد موجوگی
کی چمکدار مٹی بنائیں۔ حجاب آج ممنوع — چلمن کے باہر رہے گا۔ مرے
ہاتھ پاوں کی مٹی ازل سے ابدتک، پراسرار، مقصود بالذّات، مادّیت کمّہم
کمّہم، کمّہم۔ کیسا لمحوں کا پانی ہے۔ ساکن سمندر افق تا افق۔ بند کمرہ،
تموج کا فقدان۔ کھلتے ہوئے ہاتھ پاؤں، تضادات: ہسٹاریکل پرسپیکٹو،
چمکدار مٹی میں لت پت زمرد۔ نگاہیں۔ مرے ہاتھ پاؤں کی تحلیل موجودگی
نبیولس، دھیرے دھیرے سکڑنے منور مقامات: لیجینڈری،
لن ترانی، آہنگ — شبنم، صبا، گل

تو میں نے کہا : کیا مجھے جانتی ہو؟
وہ حیرت سے تکنے لگی : کیوں
تو میں نے کہا : بارہ حلقوں کے حلقوم کو ایک ہی تیر سے چھیدنے والا
میں ہوں
وہ کہنے لگی : کون آواز مرغِ سحر سن کے پہلی دفعہ میرے پاس آیا تھا
میں نے اس سے کہا : میں
تو میں نے کہا : یہ عجب بات ہے ! میں تو آوازِ مرغِ سحر سن کے باہر
گیا تھا ، ابھی لوٹا ہوں
لشکر محشر گھن گرج - چار سر ۔ اشتمالِ شمال و جنوب، اجتماعِ طلوع و غروب ۔
انتہا، انتہا ، انتہا ۔ تابش رشتۂ غیر اخلاق ، قدر نوعِ قدیم ــــ آمدم برسر
مطلب تہمت نا تمامی : زمانے کا رستہ مقفّل ہے ، مردانے پر میں کھڑا ہوں ۔
گذر گاہ شوریدگی کی چکاچوند سینوں میں پیوست ہے ۔ میں نے دستک سنی ۔
ہڑبڑا کر زنانے سے مردانہ اک جست میں طے کیا ۔ میرا سینہ مگر تیر سے
چھد گیا ۔ راستہ ، راستہ : تیرہ و تار ، پُرہول ! روشن ، نہایت ہی روشن . .

ھری ٹہنیاں

انگ بھبھوت رمائے
پانی سے ھوتی
کالی سرد ھوا کے سینے پر
سرخ سٹیلگمائیٹ بناتی
رانوں ، شریانوں میں ....
وقت اشدّ شدید مشوّش خاطری کا مظہر ھے
ڈھنگ سے دیکھنا جائز ماننے سے انکاری ھے
رند خراب ، خرابۂ خشت اول دیکھنا چاھتا ھے
یہ موسم ، منظر عام تلوّن ——
بحث کی بات نہیں ، قحط عقیدت عقدۂ ناموزوں ھے
دھڑکنوں کی تشریحی جدولیں ، موت ، حیات ، زائچے
سب کچھ ، پرتو استدعا کے پردے میں
یعنی ھوائے فطرت ثانیہ رکھتا ھے
بلا تخصیص صلائے عام سہی
پرو بونو پبایکو پھر بھی نہیں
تا آنکہ تدارک حال نہ ھو
باطن حشر بپا ھی رکھے گا
خواب بھیانک ، میں انچھوئی کنواری آگ
گرمی سردی بہار خزاں سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ھے

—— تمام علاقے وقفۂ خواب سے بوجھل ہیں
ہوش کے ناخن لو۔ ۔ ۔ ۔ کب تک لاٹھی ٹامک ٹوئیاں مشعلِ منزلِ خیر و عقوبت کی رسوائیاں ٹال بھیک بھڑکائیں، توڑیں پھوڑیں، گل ہو جائیں۔ دُود درشت تعفن کس کو گوارا۔ جھیلنا چُپ پتھریلی سر ٹکرانا خس کم ہونا: آدر کون کرے۔ جب خون بشارت پوروں پوروں ڈھلکے، ناخنوں کو چمکائے سجرے سرخ تو موسم کی گفتار اذیت قربت بخش ہوا ہو۔ راستہ کاٹنے والا میرا سنگی ساتھی پہروں سڑک بتائے دیکھتے دیکھتے جی کا دھوکہ جس کے لئے ہم روز و شب کی شباہتِ نوترغیبی کتنی تمناؤں کی دھول میں اٹی مور و ملخ کی خلد نشان چمکیلی جھم جھم کرتی کھردری راتوں کی بھرپور جدائی کا تلوار کٹاؤ، آؤ، آؤ، دیکھو کتنی صبح سفیدی دیواروں سے چمٹ گئی ہے

ایفروڈزیک دھوپ شناسائی نا معقول زمانے سے رکھتا ہوں
مرگِ عظیم الجثہ جشنے دارد کی تلقین کروں وو لوکا بھٹھ پڑی مری چٹی چادر بھسم کی ڈھیری ٹھنٹھ سے گولے اڑ گئے سات سمندر پار۔ ہوائیں دامن تھام کے جب کرداروں کی بتّی، عمودِ جلوۂ بعثت فتنہ بپا کا ردّ حقائق پر تفصیلی جائزہ۔ تفصیل اجمال کی یوں کہ۔ عزیز و اقارب مصلحتوں کی دیرینہ زہریلی شکایت کرنے میں۔ تنگیٔ دامنِ دل کی حکایت عبرت آج نوشتۂ کہنگی و دیوار ہوئی ہے۔ کہنا تو اتنا ہے۔ گویا یہ بھی کوئی بوالعجبی ٹھہری - اتنا تو۔ آدمی جب اعجاز بشارت جان سمجھ لے، جانئے۔

ماخذ

دیکھئے نا - میں امروز کی سرحدیں چُھوتا اس کے حقیقت سوز بدن پر ہاتھ
لگاتے ھی - آگ در و دیوار کے مغفرت آنسو پونچھے - کوئی مجھے بتلائے آخر
کون فنا کی خاطر ھاتھوں میں ھاتھ دئے پرھول پرستش پرسش صندل
ناف نہائے دھوئے بعد ازاں گھبرائے موت کی سلوٹوں سلوٹ ھو کر عین یقیں
سے اس گم گشتہ اجل کا بازو تھامنے آگے بڑھے گا ، جائزہ لے گا
ان بیکار فضیحت مشغلوں کا انجام تماشہ دیکھنے ھم بھی گئے تھے - دھینگا مشتی
ھزار سہی فی الاصل وھی کم بختی ڈھاک ھمیں فی الحال زیادہ کا ارمان نہیں
دو تین جنہیں خوش وقتی مصرف لکھتے سوچتے دور کی سوچنے والے شُبھ دن
آگ سے بخشش لوٹ کا مال نہ مانگیں خون پسینے کی گاڑھی مشقت کا
جو بھی ھے خوب ھے اندھا دھند عطائے مفلوک الحالی سے گھٹتا بڑھتا
مد و جذر کا لمحۂ نو دریافت کُھلے تا آنکہ روٹی تو بعد میں کھائیں گے ،
جسم کی آنچ میں آنتوں سے قل ھو اللہ پڑھنا یکسر حرفِ غلط مٹ جائے -
قہر میں ، قہر میں ، قہر میں پانی زمیں سے پھوٹے ، پھوٹے ، پھوٹے قسمتوں
سے یہ وقت میسر آیا ھے - صدمے کے سکتے میں بھوک پیاس کا منظرِ عام سے
غفلت ھٹنا ، چمکنا ، گھول گھاؤں کاٹھ کی روٹی رات کی لذت
کاکھڑی در درویشی عقدہ کشائے معنی ٹھہرتی رکنی رونقِ بشرہ روز و شب -
میں کڑی پوندی سنتا نہیں ھوں گونگا بہرہ زمانہ گدرائی بانہوں میں ایک
انوکھا سوال لئے لٹکائے نام کی گوند سے چسپاں تکا بوٹی گتھم گتھا عجیب
لذائذ بُو دیواروں سے اٹھتی کُربل کُربل کیڑوں مکوڑوں نے شاید -
جب تک راتوں کی آگ تڑختی - اس کی بابت قصہ کہاوت پھیلتے بڑھتے

چوراہے میں بھانڈا پھوٹ مغالطہ ہوتا تو بھی - دن کی پسینہ باس بساند
اسے موہوم تمناؤں سے - گاؤں کا گیت شرارتی ، اُس نُسا ، شرمیلا - ہر وقت
عقیدت شہوت کی خوشبوئیں لپکتیں آنکھوں ہی آنکھوں توبہ استغفار اسے
کوئی کیوں کر ٹھل سکتا ہے

کاجل ریکھ سمندر ساتھ افق سے اُبلے کُھلے گھمن گھیر سے بچھتی فرشتہ سیرت
صورتیں چومتی راہگذار پہ اہلاً سہلاً مرحبا سنتی بھکتی خلقت گوشۂ چشم پہ
آن رکی ہے - زبان لکیر سے - ماتھا چہرہ ٹھوڑی لعل لعابی لعل سے بجھتے
بھڑکتے - جھاگ زمیں کی عداوت سہتی بہتی پانیوں بہتے مد و جذر کو
تکتی گھونگے مٹھ پر آہستہ آہستہ ! ساحلِ صبحِ ازل کی سمت - کنارے
جامۂ زیبی اٹھائے ٹھٹکتے کونپلوں نرمی سے لَرزاں تھلکتے پیٹ کی لہریں
جھاگ سے دیکھتے چوری چھپے دکھ دھاک تمنا جاگ جمی ہے - سوچئے تو
متنازع فیہ وفا کے نسخے دوہری آگ میں جل بجھنے کی سیاہی دوات
ہوائیں شوق سے چیچپے لفظ سُکھانے میں بغلی جیب کا ریشمی خوشبودار
جیسے بازار سے لا کر چپکے سے نالی میں ایرولیر لباس مہذب جسم امڈتا
جھاگ سے گوشہ گوشہ کچا چمکتا چکنا - تو چکناچور زمیں سے خاک
خباثت چکھنے پہ آنکھوں کو بھرتی ، عذاب کا مرحلہ طے ہو جائے تو دیکھیں !
عقل نے گردشِ دوراں ڈُوب چمکتی وادیوں وحشی عقیدت چھوڑ کی

نام اسی کا وقت نے جو دیوار پہ لکھتے عقدہ شناسیٔ شوق سمجھتے مٹایا ،
بعد میں یاد کیا - تو لفظ کی مستورات ازل سے خفتگی عقد میں دستِ فنا کی
آگ سے چونکتے ساتھ ہی بسترِ مرد گزیدہ میں راکھ تیمم عکس پہ نقش
جیسے شربانوں کا سکتہ سمجھتا سُجھاتا خواب کے دائروں میں دیکھتا بھولتا
آگہی باندھ سمیٹتا بادل ، چاند نکلتا ، ڈوب ابھرتا